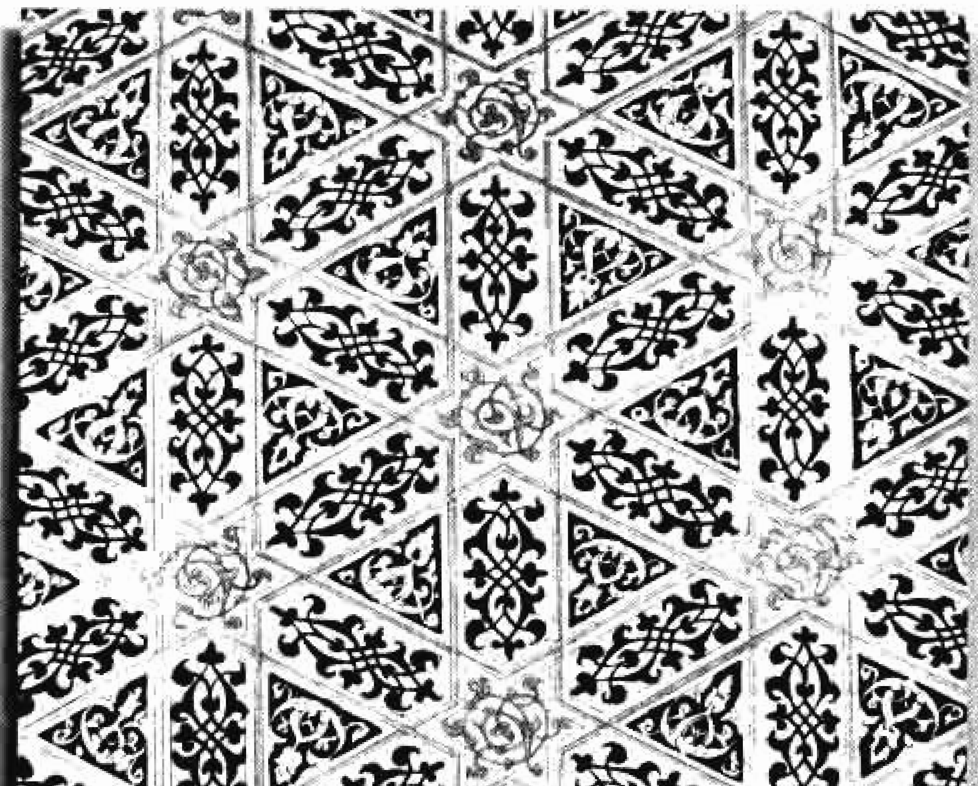
ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۹۹۸ء

مُدیر
خورشید احمد



ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد　　　　نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۳۵　　　نومبر ۱۹۹۸ء، رجب ۱۴۱۹　　　عدد ۱

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۷۸۳۳۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

ہندو ذہنیت

متحدہ قومیت کے اس سراسر جھوٹے دعوے پر جو قومی' جمہوری' لادینی اسٹیٹ بنایا جائے گا وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مسلمانوں کے لیے تو بلاشبہ غیر مسلم اسٹیٹ ہو گا' مگر ہندوؤں کے لیے لازم نہیں کہ وہ غیر ہندو اسٹیٹ ہو' بلکہ اپنی اکثریت کے بل پر وہ اس کو ایک ہندو اسٹیٹ بنا سکتے ہیں' اور واقعات سے روز بروز عیاں ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے لیے بھی میں صرف ایک صوبے کے چند واقعات بطور نمونہ پیش کروں گا۔

۱۔ سی پی کی کانگریسی حکومت کے تحت تعلقہ بورڈ چاندور کا ہندو چیرمین ۲۴ر ستمبر ۱۹۳۸ کو تمام مدارس کے نام سرکلر (نمبر ۴۴۶) جاری کرتا ہے جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ ۲ر اکتوبر کو مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے دن بچے اور استاد سب مل کر ان کی تصویر کی پوجا کریں۔ یہ سرکلر بلاامتیاز ہندو و مسلم سب مدارس کو سرکاری طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔

۲۔ اسی صوبے کی کانگریسی حکومت محکمہ پولیس کے حکام کو (جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں) ہدایت نامہ بھیجتی ہے کہ جس جلسے یا تقریب میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جائے اور وہ وہاں موجود ہوں تو انھیں بھی عام حاضرین کے ساتھ قیام تعظیمی کرنا چاہیے۔ اس واقعے کو خود وزیراعظم نے اپنے ایک پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۸ جون ۱۹۳۸)

۳۔ ساگر (صوبہ متوسط) کی میونسپل کمیٹی کا صدر' مسلمان طلبہ کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ بندے ماترم گانے میں شریک نہ ہوں گے تو انھیں مدرسے سے نکال دیا جائے گا۔ اس واقعے کو بھی خود سی پی کے وزیراعظم نے مذکورہ بالا پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔

۴۔ اسی صوبے کے ایک سرکاری مدرسے میں انجمن ترقی اردو کے نمایندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان بچے ہندو بچوں کے ساتھ مل کر سرسوتی کی پوجا کر رہے تھے' اور ان کو سلام کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر "جے رام جی کی" کہنا سکھا دیا گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو کا خط گاندھی جی کے نام' اخبار پیام' مورخہ یکم ستمبر ۱۹۳۸)

---- ان واقعات کے علاوہ بہار' یوپی' مدراس اور سی پی میں قربانی گاؤ کو حکماً بند کرنے اور ہندی کو "ہندستانی" کے پرفریب نام کی آڑ میں بزور رائج کرنے اور زبان سے عربی و فارسی کے زبان زدعام الفاظ کو نکال کر نئے غیر مانوس الفاظ گھڑنے اور سرکاری ملازمتوں میں کھلم کھلا امتیاز برتنے کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا موجب تطویل ہو گا۔ جو کچھ ہمیں ثابت کرنا تھا اس کے لیے مذکورہ بالا شواہد کافی ہیں۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ' ترجمان القرآن' جلد ۱۳' عدد ۲' ۳' ۴' شعبان' رمضان' شوال' ۱۳۵۷ھ' اکتوبر' نومبر' دسمبر ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

خورشید احمد

تحریک اسلامی انبیاے کرام علیہم السلام کے شہادت حق کے جس مشن کی امین اور علم بردار ہے اس کا پہلا اور آخری ہدف اللہ کے بندوں کو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے اس کی بندگی کی زندگی کی طرف دعوت دینا ہے۔ اسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام، رہنمائی اور طریقے پر کاربند ہو کر اور اللہ کی زمین پر اللہ کی مرضی اور اس کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کے ذریعے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تحریک اسلامی یہ عظیم خدمت بالکل انھی مقاصد کے لیے، اسی طریقہ کار کے مطابق اور انھی جذبات اور احساسات کے ساتھ انجام دینا چاہتی ہے جن کی تعلیم اور نمونہ اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فراہم کیا--- یہی وہ چراغ نور ہے جس سے ہر داعی اور دعوت کے علم بردار کو سارے جہاں کو مستفیض کرنا ہے۔ یہ سلسلہ ان شاءاللہ اس وقت تک جاری و ساری رہے گا جب تک زمین پر کوئی متنفس موجود ہے۔

تحریک اسلامی نے جہاد زندگی کی جو شاہراہ اختیار کی ہے اس میں جن چیزوں کو مرکزی اہمیت حاصل ہے وہ دعوت، ایمان اور اخلاق کا احیا و استحکام، فرد اور معاشرے کا تزکیہ و تربیت، حق و باطل کی کش مکش میں حق کے غلبے کے لیے منظم سعی و جہد، اور اللہ کے دین کی اقامت اور غلبے کے لیے ایسا انقلاب قیادت ہے جس کے نتیجے میں انسانی زندگی اور تہذیب و تمدن کی زمام کار فساق و فجار کے ہاتھوں سے اللہ کے مطیع و فرماں بردار اصحاب سیرت و خدمت کی طرف منتقل کی جا سکے تاکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کاروبار اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چلایا جا سکے اور انسان مکمل طور پر عباد الرحمٰن بن سکیں۔ اس جدوجہد کی روح اور اس کی کامیابی کے حقیقی عوامل، اللہ سے بے پناہ محبت اور اس کی رضا طلبی اور بندگی کا شوق، انسانوں سے گہری ہمدردی اور انھیں دنیا اور آخرت کے عذاب اور خسران سے

پہنچانے کی لگن' خود اپنی سیرت و اخلاق کی ہر لمحہ فکر اور اللہ کے بندوں اور بندیوں تک دین کے پیغام اور احکام کو پہنچانے اور ان پر کاربند ہونے اور کرنے کی جدوجہد ہے۔

یہ کام بہ یک وقت تین میدانوں میں جدوجہد سے عبارت ہے' یعنی:

اول: اللہ سے تعلق' اس کی یاد سے دل کو ہر لحظہ معمور رکھنا' اس کے احکام اور ہدایات سے واقفیت اور ان کی اطاعت و پیروی کا شوق و ذوق اس کی ناراضی کا خوف' اس کی خوشنودی کی طمع اور اس سے قریب تر ہونے کی کوشش تاآنکہ وہ کیفیت پیدا ہو جائے جسے اس ایک حدیث قدسی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کام کرتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ (رب کے راستے پر) گامزن ہوتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا' بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کارکشا' کارساز

دوم: ہر لمحے اپنے ایمان' اپنے اخلاق' اپنے رویوں' اپنے اعمال کی فکر کہ اللہ کی محبت اور اس کے بتائے ہوئے راستے کی خلاف ورزی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اللہ کی رضا کے حصول اور اس کے دین کی اقامت کی جدوجہد ہو ہی اس وقت سکتی ہے جب صرف دل ہی اس نور سے منور نہ ہوں بلکہ داعی کی زندگی بھی اس دعوت اور پیغام کی شہادت دے رہی ہو اور اس کا عمل خود اس کے قول کی تردید اور تکذیب نہ کر رہا ہو۔ برف اسی وقت دوسروں کو ٹھنڈک پہنچا سکتی ہے جب خود مجسم برودت ہو اور آگ سے گرمی اسی وقت پہنچ سکتی ہے جب وہ خود جل رہی ہو اور شعلہ فشاں ہو۔

سوم: اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ زندگی کے پورے نظام کی اصلاح اور تبدیلی کی جدوجہد اس دعوت کا لازمی حصہ ہے۔ اس کا مقصود صرف فرد کی اصلاح ہی نہیں تمام انسانوں کی اصلاح اور اللہ کی ساری زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنے کی سعی ہے۔ فطری طور پر اس کا آغاز گھر اور خاندان سے ہوتا ہے۔ محلّہ' بازار' مدرسہ اور معاشرہ اس کا اولیں ہدف ہیں' انھی کا تسلسل ہے اجتماعی زندگی اور اس کے تمام ادارے اور کارفرما قوتوں کو اللہ کا مطیع بنانا' نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا' اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغاوت کرنے والی ہر قوت سے نبرد آزما ہونا' اور زندگی کے چلن کو اللہ کے دین کے رنگ میں رنگنے کی منظم اور اجتماعی جدوجہد' تاآنکہ کافروں کا بول نیچا ہو اور اللہ کا کلمہ غالب اور سربلند ہو' اللہ زبردست دانا و بینا ہے۔ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (التوبہ ۹: ۴۰) اور اس کے لیے ضروری ہے: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (التوبہ ۹: ۴۱) "نکلو' خواہ ہلکے ہو یا بوجھل' (یعنی بے سروسامان ہو یا وسائل سے آراستہ) اور جہاد

کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

پہلے نبی اور رسول سے لے کر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ کے ان تمام برگزیدہ بندوں کا مشن ایک ہی تھا: یعنی اللہ کے دین کی دعوت اور اس کی اقامت!

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (الشوریٰ ۴۲: ۱۳)

اس نے تمھارے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ○ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (المائدہ ۵: ۶۷-۶۸)

اے پیغمبرؐ، جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمھارے مقابلے میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ "اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں"۔

اللہ نے اس دعوت کے سلسلے میں اپنے انبیا کرام علیہم السلام پر جو ذمہ داری ڈالی، وہی ذمہ داری امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے تاکہ یہ کار نبوت تا ابد جاری و ساری رہے۔ اور اوپر پیغمبری کا حق ادا نہ کرنے کی جو تنبیہ خود اللہ نے اپنے رسولؐ کو دی ہے، دراصل اس کے مخاطب وہ سب ہیں جو آپؐ کے کلمہ گو ہیں اور اس ذمہ داری کے امین۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ ۲: ۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر (حق کے) گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

یہی وہ شرف ہے جس نے اس امت کو "امت وسط" بنایا اور یہی وہ ذمہ داری جس کی بنا پر اسے "خیر امت" قرار دیا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
(آل عمرٰن ۳: ۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

امت مسلمہ کو بحیثیت امت یہ کام انجام دینا ہے اور اگر امت غافل ہو تو اس میں سے ایک گروہ کو تاقیامت یہ ذمہ داری ادا کرنی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (آل عمرٰن ۳: ۱۰۴-۱۰۵)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں' اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلاف میں مبتلا ہوئے۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے۔

قرآن نے فلاح اور عذاب دونوں کے راستے صاف کھول کر بیان کر دیے ہیں۔ اب یہ فیصلہ ہمیں کرنا ہے کہ کون سے راستے کو اختیار کریں۔ الحمدللہ تحریک اسلامی نے اس دور میں امت کے سامنے ایک بار پھر دعوت اور فلاح کی کشادہ اور روشن شاہراہ کی نشان دہی کر دی ہے۔ اس راہ پر پیش قدمی کے لیے ان تینوں پہلوؤں یعنی رب سے تعلق' تعمیر سیرت اور دعوت انقلاب کو بہ یک وقت اور ہر لحظہ ساتھ ساتھ انجام دینا ہے۔ تینوں کا یکساں اور مربوط اہتمام ہی اس راستہ کی انفرادیت اور امتیازی شان ہے۔ یہی اس کی طاقت' صحت اور توانائی کا ضامن ہے اور یہی آخر کار دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا راستہ ہے۔ یہی اس امت کا مشن ہے' یہی اس کا مسلک ہے اور یہی اس کی ترقی کا زینہ!

تحریک اسلامی کے دعوتی' تربیتی اور انقلابی پروگرام میں اجتماع عام کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ جس طرح بیعت عقبٰی اولیٰ اور ثانی کے اجتماعات اولین تحریک اسلامی کے لیے ہجرت' جہاد' ریاست مدینہ' فتح مکہ اور غلبہ دین کے اولین سنگ میل بنے اور حجتہ الوداع اسلام کے عالمی قوت بننے کا مظہر' اسی طرح ہر دور میں تحریکی اجتماعات جہاں جدوجہد کا آئینہ اور پیمانہ بنے وہیں اس تحریک کے کارکنوں کے درمیان افہام و تفہیم' تذکیر و تجدید' شوریٰ اور احتساب' اجتماعی سوچ بچار اور منصوبہ بندی اور نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے

کے لیے نئے عہد و پیمان اور منصوبہ بندی کا ذریعہ بنے۔

برعظیم پاک و ہند میں ۲۵ اور ۲۶ اگست ۱۹۴۱ کو لاہور شہر کے قلب میں ۷۵ نیک نفس دین کے پروانوں نے دعوت اسلامی کی جو شمع روشن کی' آج اس کی روشنی سے پورے برعظیم ہی میں نہیں' چاردانگ عالم میں نور کی کرنیں ضوفشاں ہیں۔ عزم تو یہی تھا کہ ہر سال ایسے ہی اجتماعات عام کا اہتمام کیا جائے گا جو دعوت کے استحکام اور فروغ کے لیے' منبع اور مرجع کا کام انجام دیں گے۔ جس طرح پوری امت حج کی عظیم عبادت اور عالم گیر اجتماع سے ہر سال نئی قوت' نیا خون اور نیا جذبہ حاصل کرتی ہے' اسی طرح بلاتمثیل' دعوت اسلامی کے علم بردار' اپنے ان اجتماعات کے ذریعے روح' فکر' صف بندی اور اجتماعی جدوجہد کے لیے نئی غذا اور قوت حاصل کریں گے۔ لیکن بوجوہ اجتماعات کا انعقاد ہر سال ممکن نہ ہو سکا۔ پھر بھی تحریک اسلامی نے اپنے اہم اور کلیدی پروگرام کے طور پر وقتاً فوقتاً اجتماعات عام کا اہتمام کیا ہے۔ اس سال یہ اجتماع اسلام آباد کی فیصل مسجد کے دامن میں تین سال کے بعد منعقد ہوا' اور یہ ایسا موقع تھا جب صرف پاکستان ہی نہیں' پوری ملت اسلامیہ کی تاریخ کے ایک نازک مرحلے سے دوچار ہے' جب بیسویں صدی اپنے اختتام کی گھڑیاں گن رہی ہے اور دنیا اکیسویں صدی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

آج پاکستان' ملت اسلامیہ اور پوری دنیا شدید ترین بحرانوں کے گرداب میں ہے۔ فکری انتشار اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ وقت کے غالب نظریات ناکام ہو چکے ہیں اور سارے جھوٹے خدا سرنگوں ہیں۔ معاشی ظلم اور افراتفری کا دور دورہ ہے۔ سیاسی دروبست درہم برہم ہے۔ دنیا ایک نئے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے جبکہ مسلمان بحیثیت مجموعی غافل اور دوسروں کے دست نگر ہیں اور اپنی تمام تر عددی قوت اور معاشی وسائل کے باوجود بے وزن اور غیر موثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ فلسطین ہو یا کشمیر' بوسنیا ہو یا کوسووو' شیشان ہو یا تاجکستان' افریقہ ہو یا ایشیا' یورپ ہو یا امریکہ--- مسلمان اپنوں کی بے وفائی اور غیروں کی چیرہ دستی کا شکار ہیں۔ صرف اسلامی تحریکیں ہی ملت کو اس دوہرے استبداد کے چنگل سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

ان حالات میں اسلام آباد کا اجتماع غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ اس میں ملک کے گوشے گوشے سے شمع حق کے متوالوں نے شرکت کی۔ ان کے ساتھ عالمی اسلامی تحریکوں کے قائدین' امت کی وحدت اور اسلام کے بنیان مرصوص بنانے والے جذبہ کی علامت کے طور پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اس اجتماع کا انعقاد خود ایک بہت بڑی سعادت اور مستقبل کے لیے بیش بہا برکتوں کا پیامبر ہے۔

جماعت اسلامی کے یہ اجتماعات سیرو تفریح کا میلہ یا شان و شوکت کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہوتے۔ اس کا مقصد خالص روحانی اور دعوتی ہے۔ یہ اللہ کی رضا کے حصول کی ایک اجتماعی کوشش اور اس کے راستے میں سفر

کرنے اور مشقتیں جھیلنے' قربانی دینے اور سعی و جہد کرنے کا تجربہ ہیں۔ یہ تحریک کے کارکنوں کے لیے ایک تربیت گاہ اور عامۃ الناس کے لیے تحریک کو سمجھنے کا ایک نادر موقع ہیں۔ اجتماع عام کے مقاصد یہ ہیں:

۱۔ انسانی وسائل کی جو قوت تحریک کو حاصل ہے وہ امیر کی پکار پر ایک مرکز پر جمع ہو جائے اور وقت اور مال کی قربانی دے کر اپنے مرکز اور محور سے جڑ کر اسے مزید مضبوط کرنے کا اہتمام کرے۔ اجتماع کے آئینے میں ہم اپنے کام اور کارکردگی کی حقیقی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک مقیاس اور پیمانہ ہے جس سے آپ اپنی قوت کا اندازہ لگا سکتے ہیں' اپنے وسائل اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لے سکتے ہیں اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے مستقبل کے کاموں کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔

۲۔ اجتماع تحریک سے متعلق افراد کو باہم ملنے' ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے' ان کی صلاحیتوں اور عزائم کا ادراک کرنے اور وقت کے مسائل کے بارے میں مشورے اور تبادلہ خیال کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک بڑا قیمتی موقع ہوتا ہے جو زندگی میں بار بار نہیں آتا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر ہی اجتماع کی کامیابی کا انحصار ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ سفر کرنے اور معمولات سے ہٹ کر ایک قسم کی درویشی کے عالم میں ساتھ رہنے کا تجربہ ہے۔ اس میں ایک دوسرے کے لیے ایثار اور اپنی ضرورت پر اپنے بھائی بہن کی ضرورت کو فوقیت دینے کے زریں مواقع آتے ہیں اور تزکیے اور تربیت کا بہترین سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ محض دنیوی یا تجارتی سفر نہیں' بلکہ امیر کی پکار پر دعوت اسلامی کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے گھربار چھوڑ کر چند دن کی خانہ بدوشی اور سیاسی تجربہ ہے لیکن ایسی خانہ بدوشی جو زندگی کی تاریکیوں کو روشنی میں بدلنے کی تربیت دیتی ہے اور جس کے نتیجے میں وقت' آرام اور سہولتوں کی قربانی دے کر مقصد حیات کی خدمت' جذبہ اور لذت حاصل ہوتے ہیں۔ اس کیفیت سے آپ جتنے شاد کام ہوں' تو اتنا ہی یہ سفر کامیاب ہے۔ اگر اس سے آپ کا دامن خالی رہے تو پھر اجتماع کا یہ "سلوک" بھی ثمرآور نہ ہو سکا!

۳۔ اجتماع کا ایک مقصد اپنے مشن' دعوت اور لائحہ عمل کا بہتر شعور حاصل کرنا' تحریک کے کارکنوں میں فکری اور عملی یکسوئی پیدا کرنا' ذہنی الجھنوں اور عملی مشکلات کے بارے میں رہنمائی پانا اور مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی فکری' اخلاقی اور روحانی غذا حاصل کرنا' ساتھیوں کے درمیان نئے عہد و پیمان استوار کرنا اور انفرادی اور اجتماعی کوششوں کے لیے بہتر منصوبہ بندی کا اہتمام کرنا ہے۔ اس موقع پر شوریٰ' اجتماع ارکان' کارکنوں کے خصوصی کنونشن اور اجتماع عام سب کا اہتمام ہوتا ہے' اور ان میں سے ہر ایک تحریک کے شورائی اور اجتماعی نظام کو موثر بنانے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

۴۔ اجتماع تحریک کی دعوت اور اس کے پیغام کو قوم اور اس کے مختلف طبقات کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کا ایک عملی نمونہ چند دن کے لیے زمین پر استوار کر دیتا ہے۔ جس طرح ایک تاجر اپنے مال کو

بازار میں سجا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے' بالکل اسی طرح یہ اجتماع وہ موقع ہے جب تحریک اپنی تمام متاع کو قوم کے سامنے رکھ دیتی ہے تاکہ وہ جان سکے کہ یہ کیا کام انجام دے رہی ہے اور قوم اور انسانیت کو کس راستے کی طرف بلا رہی ہے۔ یہ اجتماع صرف ہمارے داخلی نظام ہی کی اصلاح اور استحکام کا ذریعہ نہیں' اس کے ذریعے ہم پوری جماعت کو ایک کھلی کتاب کی طرح پوری قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اسے دعوت دیتے ہیں کہ آئے اور ہمیں سمجھنے کی کوشش کرے۔ ہمارے بارے میں صرف سنی سنائی باتوں پر انحصار نہ کرے بلکہ ہماری بات کو ہماری ہی زبان سے سنے' ہمارے عمل سے جانچے' ہمارے اداروں اور کاموں سے واقفیت حاصل کرے' ہمارے درمیان اٹھ بیٹھ کر' کھا پی کر' عبادتوں میں شریک ہو کر' بحث و گفتگو میں حصہ لے کر ہمیں دیکھے اور سمجھے--- اگر ہم میں کچھ خامیاں دیکھے تو ہماری اصلاح کی کوشش کرے اور اگر ہماری دعوت اور ہمارے انداز کار کو خیر پر مبنی اور ملک و ملت کے لیے نجات کا راستہ پائے تو پھر محض خاموش تماشائی نہ بنے بلکہ رزم حق و باطل میں ہمارا ساتھ دے تاکہ ہم سب مل کر اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

یہ ہیں ہمارے اجتماعات کے مقاصد اور اہداف۔ ان کا تعلق محض اجتماع کے تین دنوں سے نہیں بلکہ اجتماع سے پہلے کی تیاری اور اجتماع کے دوران حصول مقاصد کی سعی سے لے کر اجتماع کے بعد اس کے اثرات کو سمیٹنے اور اگلے اجتماع تک اس جدوجہد کو جاری رکھنے سے ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جس کے ذریعے اجتماع کی کامیابی یا اس کی برکتوں سے محرومی کو جانچا جائے گا۔

عالمی سطح پر اسلامی تحریکیں ایک بڑے نازک' صبر آزما لیکن فیصلہ کن دور سے گزر رہی ہیں۔ مغربی استعمار اپنی آخری ہچکیاں لے رہا ہے لیکن خود دم توڑتے ہوئے بھی دوسروں کا گلا دبانے اور خون چوسنے کا عمل پورے شد و مد سے جاری ہے۔ اشتراکیت کا قصر شاہی زمین بوس ہو چکا ہے۔ روس' جو کل تک ایک عظیم طاقت اور عالمی غلبے کا دعوے دار تھا' آج سیاسی انتشار' اخلاقی خلفشار اور سماجی انارکی کی تصویر بن گیا ہے' معاشی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے۔ روبل جس کی کبھی شان یہ تھی کہ ایک روبل کے لیے ڈھائی اور تین ڈالر صرف کرنے پڑتے تھے آج ایک ڈالر کے دو ہزار ہیں اور پتا نہیں کہ اگلے لمحے یہ سلسلہ کن پستیوں تک پہنچے گا۔ ایک وقت تھا کہ خروشیف اقوام متحدہ میں جوتا دکھا رہا تھا اور بریژنیف غرور سے اعلان کر رہا تھا کہ جس ملک پر ایک بار اشتراکیت کا جھنڈا لہرا جائے پھر وہ کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔ اور آج عالم یہ ہے کہ وہی روس' امریکہ' جرمنی اور آئی ایم ایف ہی نہیں' ایک ایک سرمایہ دار کے آگے کشکول گدائی لیے پھر رہا ہے۔ اب اس کی سطوت کا یہ حال ہے کہ اس کا صدر سہارے کے بغیر دو قدم چلنے کی سکت نہیں

رکھتا۔ امریکہ جو دیوار برلن کے منہدم ہونے پر عالمی سرمایہ داری اور لبرل جمہوریت کی آخری اور ناقابل تسخیر فتح کے شادیانے بجا رہا تھا آج پھر کساد بازاری کی گرفت میں ہے۔ جرمنی اور یورپ میں بے روزگاری آسمان کو چھو رہی ہے۔ بڑے بڑے بنک معرض خطر میں ہیں۔ حصص کی منڈیاں عدم استحکام کا شکار ہیں۔ ڈالر' ڈش مارک اور ین بے وزن ہو رہے ہیں۔ سیاسی اور معاشی ہر میدان میں کھچاؤ اور اضطراب ہے اور ایک بار پھر تیسرے راستے کی تلاش کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بیمار روس کا بیمار صدر اگر سیاسی اور معاشی دیوالیہ پن کی علامت ہے تو امریکہ کا صدر بھی اخلاقی دیوالیہ پن کی تصویر بن چکا ہے اور صاف نظر آ رہا ہے کہ "وہ عالم پیر مر رہا ہے"۔

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

البتہ فرسودہ ظالمانہ نظام کے پجاری اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کوئی "عالم نو" پیدا نہ ہو سکے اور اس سلسلے میں ان کا اصل ہدف اسلامی احیا کا راستہ روکنا اور اسلام اور مسلم امت کو انسانیت کے لیے نئے خطرے کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ میڈیا کی ساری قوت اس جھوٹ کو پھیلانے اور اسے قبول عام کا مقام دینے کے لیے وقف ہے۔ سیاسی قیادتیں اسلامی تحریکوں اور ان کی قیادتوں کو نشانہ ستم بنائے ہوئے ہیں۔ خود مسلم ممالک کے حکمران اور ان کے معاون سول اور فوجی عناصر نئے نظام کے داعیوں کو ظلم و ستم اور جبر و تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں اور اس تاریخی حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے' اور اسے جتنا دبایا جائے' یہ اتنا ہی پھر ابھرتا ہے۔

گزشتہ پچاس ساٹھ برس میں دنیاے اسلام کے گوشے گوشے میں ان تحریکوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اور جو شمعیں جلائی ہیں' باد سموم کے یہ جھونکے ان کی روشنی کو ختم نہیں کر سکتے۔ اللہ کا قانون ہے کہ "بڑھتا ہے ذوقِ جرم یاں ہر سزا کے بعد"۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ۔

جیسے جیسے اہلِ حق پر شدّتیں بڑھتی گئیں
ایسے ایسے روشنی بام و در بڑھتی گئی

موجودہ عالمی بحران کے دھندلکے میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ اسلام اور تحریک اسلامی ہی انسانیت کی اصل امید اور روشن مستقبل کی پیامبر ہیں۔

پاکستان کے حالات بھی ایک بڑی تبدیلی کی ضرورت کو نمایاں کر رہے ہیں۔ چودہ کروڑ انسانوں کا یہ ملک جو اللہ کے فضل خاص سے آج ایک ایٹمی طاقت بھی ہے' سیکولر نظاموں اور قیادتوں کے تمام تر تجربات کرنے کے بعد اس مقام پر آگیا ہے جسے ایک فیصلہ کن موڑ کہا جا سکتا ہے۔ ایک طرف اسلام کی شاہراہ اور

ایک نئی خدا ترس' دیانت دار' عوام دوست اور باصلاحیت قیادت کی ضرورت ہے جو اب تک کی مقتدر قوتوں کی حاشیہ نشین نہ ہو اور قوم کی زندگی میں ایک باب نو شروع کر سکے اور دوسری طرف یہ پرانے نظام کے مجاور ہیں جو اپنے پیٹ کی دوزخ بھرنے' ملک کی عزت و عصمت کو بیچ کھانے اور برعظیم کے مسلمانوں کی اس قیمتی متاع کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے درپے ہیں۔ اب کوئی تیسرا راستہ ممکن نہیں۔ ایک طرف تباہی اور ملک کا خدانخواستہ تتر بتر ہونا اور آخرکار آزادی ہی سے محروم ہو جانا ہے تو دوسری طرف ظالمانہ نظام اور اس کے محافظوں سے نجات کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ ---- اب آزادی کے تحفظ' دین و ایمان کی حفاظت' عزت و آبرو کی بازیافت اور مسائل کے دلدل سے نکلنے اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۸ کا اسلام آباد میں منعقد ہونے والا اجتماع عام اس جدوجہد کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۸-۲۹ ستمبر ۱۹۹۸ کی کلیدی قرارداد میں دعوت کا بے لاگ جائزہ اور موجودہ حکومت کی مایوس کن کارکردگی کا کچا چٹھا پیش کر کے جس لائحہ عمل کا اعلان کیا ہے وہ نہ صرف وقت کی پکار ہے بلکہ اس ملک کو درپیش پیہم بحرانوں سے نکلنے کا واحد راستہ ہے۔ قرارداد کا یہ پیغام اجتماع کے منشور اور قوم کے لیے زندگی اور ترقی کا پروانہ ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کی نگاہ میں آج نجات کی راہ شریعت کا عملی نفاذ' سامراجی دور سے ورثہ میں پائے جانے والے نظام کی تبدیلی اور انقلاب قیادت ہے۔ اس کے لیے ہمارا ہدف عوام کی بیداری' ان کو ان کے حقوق کے حصول اور اپنے دین' ثقافت اور اقدار کے تحفظ کی جدوجہد کے لیے منظم اور متحرک کرنا' سامراجی اور مفاد پرست طبقاتی نظام کو ختم کرنے کی ملک گیر تحریک اور نظام انتخاب میں ایسی تبدیلیاں اور اصلاحات کا نفاذ ہے جن کے ذریعے عوام کی حقیقی اور دیانت دار قیادت کو برسراقتدار لانے کا موقع مل سکے۔ آج ملک کو عدل و انصاف' امن و امان اور خوش حالی سے ہمکنار کرنے اور ان کی آزادی' عزت اور تہذیب و ثقافت کی حفاظت کے لیے جس اسلامی انقلاب کی ضرورت ہے وہ تقاضا کرتا ہے کہ اصل ہدف موجودہ ظالمانہ نظام کی تبدیلی اور ایک دیانت دار' پرعزم اور باصلاحیت قیادت کو بروئے کار لانا ہے۔ ضرورت ایک ایسی قیادت کی ہے جو خود شریعت کی پابند ہو' اسلام پر عمل پیرا ہو اور حکمرانی نہیں خدمت کا جذبہ رکھتی ہو' جس کا دامن بدعنوانی اور کرپشن سے پاک ہو اور جو اپنے وسائل کے اندر رہ کر زندگی گزارنے کے راز سے واقف ہوں' جو جذبہ قربانی و جہاد سے سرشار ہو' جو امریکہ اور بھارت کے ایجنڈے پر عمل درآمد کی بجائے پاکستان کے نظریے اور اس کے عوام کے مفاد کے حصول کے لیے قربانی اور ایثار کر سکتی ہو۔ قوم جب تک مفاد پرست' آزمائے ہوئے اور قوم کی امانتوں میں خیانت کرنے والی قیادت کو ہٹا کر ایسی

قیادت نہیں لاتی جو ظلم اور مفاد پرستی کے نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں' اس وقت تک ملک و ملت بحرانوں کے اس طوفان اور ذلت اور تباہی کے اس غار سے نہیں نکل سکتی۔ لہٰذا مجلس شوریٰ قوم کو اس انقلابی اور تعمیری پروگرام کی طرف بلاتی ہے جس کے نتیجہ میں نظام اور قیادت دونوں تبدیل ہو سکیں' یہ ملک شریعتوں کی برکتوں سے مستفید ہو سکے اور پاکستان اپنی اصل منزل کی طرف گامزن ہو سکے۔

ہم اس اجتماع عام کی کامیابی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں تحریک' اس کے کارکن اور قیادت اور ان شاء اللہ پوری قوم اور خصوصیت سے اس کے تمام سوچنے سمجھنے والے عناصر کے درمیان یکسوئی پیدا ہو گی اور سب ایک نئے عزم اور امید کے ساتھ اپنے ملک کو اسلام کی شاہراہ پر قائم و مستحکم کرنے کی جدوجہد میں نئے انہماک اور جذبہ خدمت و جہاد سے سرگرم ہوں گے۔ آج ملک و ملت جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں اور جو خطرات سروں پر منڈلا رہے ہیں' ان میں غفلت اور کاہلی سم قاتل ہیں۔ حالات کا مقابلہ صرف جدوجہد اور پیہم جدوجہد ہی سے ہو سکتا ہے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اس کا ہے

آج وقت کا تقاضا ہے کہ تحریک اسلامی کے کارکن خود ہی متحرک نہ ہوں بلکہ پوری قوم کو متحرک کریں۔ یہ وقت گھروں میں بیٹھنے کا نہیں' باہر نکل کر اپنی دعوت اور اپنا پیغام گھر گھر پہنچانے اور ایک ایک فرد کو اپنا ہم نوا بنا کر جدوجہد میں شریک کرنے کا ہے۔ اس کے لیے تیاری کریں' لوگوں سے ملیں' ان کو مطمئن کریں اور اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو بچانے اور حقیقی معنی میں ایک اسلامی معاشرہ اور ریاست بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ ذاتی ملاقاتوں سے لے کر اجتماعی پروگراموں تک یہی مرکزی روح (theme) ہونا چاہیے۔ میڈیا اور بااثر طبقات کو خصوصی توجہ کا مرکز بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری آواز قوم کی آواز بن جائے۔ اپنی تنظیم کو بھی مضبوط کریں لیکن وقت کی اصل ضرورت دعوتی اور سیاسی کام کی ہے۔ یونین کونسل کی سطح پر تنظیم سازی کی فکر ہونی چاہیے جو تحریک کی ممبر سازی کا اصل ہدف ہے۔ ایسا تنظیمی ڈھانچا بنایئے اور ایسی سرگرمیوں کو اپنا محور بنایئے کہ لوگ متحرک ہو سکیں۔ قرآن کی تعلیم' خود انحصاری کی بنیاد پر مسائل کے حل کی کوشش' محلے اور علاقے کو ظلم' جرم اور بداخلاقی سے پاک کرنا' علاقے میں تعلیم اور ہنر سکھانے کے اداروں کا قیام جیسی سرگرمیوں کو فروغ دیں۔ ان سب کے ساتھ سیاسی تبدیلی اور زمام کار صحیح ہاتھوں میں پہنچانے کی جدوجہد میں لوگوں کو شریک کر کے اصلاح و انقلاب کی ایک قوت بن کر' ملک کو

ظالموں کے چنگل سے نکال کر اس کے صحیح خادموں کی امان میں دینا وقت کی ضرورت اور تحریک کا ہدف ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے سب سے زیادہ اللہ سے تعلق کو جوڑنے اور خود اپنے نفس کا مسلسل احتساب کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم یہ سارا کام کسی دنیوی مفاد کی خاطر نہیں کر رہے۔ ہمارے سامنے صرف اللہ کی رضا اور اللہ کے بندوں کو ظلم اور عصیان کے تسلط سے نجات دلا کر' اللہ کی بندگی اور اللہ کے بندوں کی خدمت پر قائم نظام کی آغوش میں لانا ہے۔ یہ ساری جدوجہد اخلاقی اصولوں کی مکمل پاس داری' انسانوں کی ہمدردی' حق و انصاف اور اعتدال و توازن کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اور اپنا اجر صرف اپنے رب سے حاصل کرنے کی آرزو کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس سے ہمارے کام میں برکت اور جدوجہد کو نصرت نصیب ہو گی۔

اس کام کو انجام دینے کے لیے یہ بات بھی سمجھنا بہت ضروری ہے کہ عالم اسباب میں ہماری کامیابی کا انحصار عوام کی بیداری' عوام کی تائید' عوامی دباؤ اور آخر کار ان کے انتخابی تعاون پر ہے۔ اس لیے ہر مرحلے پر اور ہر لمحہ ہماری کوشش تحریک کی عوامی اساس کو وسیع کرنے' عوام اور ان کے مقتدر طبقوں کو دعوت کے راستے شریک جدوجہد کرنے' ان کی تربیت اور ان کو اپنے میں سمو لینے کی کوشش ہی ہمارے پروگرام کی اصل اور روح ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس ہدف کا صاف اظہار بانی تحریک نے ۱۹۴۲ کے دربھنگہ کے اجتماع کے موقع پر اپنی اختتامی تقریر میں کیا تھا۔ آج ۵۵ سال کے بعد ہمیں جائزہ لینا ہے کہ ہم اس ہدف سے کتنے قریب آئے ہیں اور ایک نئے عزم کے ساتھ اس ہدف کے حصول کے لیے تن' من' دھن کی بازی لگا دینی ہے۔

> یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشے کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لیے مدت مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیش نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کردار کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور کسی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈرشپ کا منصب اسے حاصل ہو جائے۔ مگر صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اس سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہییں۔ تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں"۔ (روداد جماعت اسلامی' حصہ اول' ص ۹۹)

اسی طرح ۱۹۴۶ میں دارالاسلام میں منعقدہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بانی تحریک نے فرمایا:

"پانچواں کام یہ سامنے ہے کہ رائے عام کو جذب کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر منظم کوشش کی

جائے۔۔۔ ضروری نہیں کہ عوام پورے کے پورے ہمارے رکن بن جائیں۔ ہمارے مدعا کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ باشندگان ملک کی ایک کثیر تعداد حق کو حق مان لے' ہمارے مقصد کی صحت کی معترف ہو جائے اور ہمارا اخلاقی اثر اس پر قائم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آگے چل کر ہم جو قدم اٹھائیں گے اس میں عوام کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوں گی"۔ (روداد جماعت اسلامی' حصہ دوم' ص ۳۵)

اس کے لیے جس حکیمانہ طریق کار کی تلقین جماعت کی قیادت نے کی تھی اس کی تذکیر کی بھی ضرورت ہے۔

"اپنی جماعت کے لٹریچر میں سے آسان آسان چیزیں سبقاً سبقاً پڑھائی جائیں اور اس دوران میں نہ صرف اپنے خیالات سے ان کے ذہن کو متاثر کیا جائے بلکہ ان کے ساتھ مساوات' ہمدردی' اخوت اور عالی ظرفی کا ایسا برتاؤ کیا جائے جس سے ان کے دل مسخر ہو جائیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش کیجیے۔ ان کی ہر مصیبت اور تکلیف میں ممکن ہو تو عملاً کام آیئے ورنہ کم از کم ہمدردی کا اظہار کیجیے۔ اپنے طرز عمل سے ان پر ثابت کر دیجیے کہ آپ کسی قسم کے امتیازات کے قائل نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے اور اونچے طبقوں میں جھوٹا فخر پایا جاتا ہے' اس کا کوئی شائبہ آپ کے اندر نہ پایا جائے۔ اس کے ساتھ بہت مخلصانہ طریقے سے ان کی اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان کے اندر جو "انسان" سو رہا ہے' جسے معاشی خستہ حالی نے' جہالت نے' سوسائٹی کی اخلاقی اور ذہنی پستی نے سلا دیا ہے' اسے جگایئے اور ان کے اندر اس انسانی عظمت کا شعور پیدا کیجیے جس کی بنیاد اسلام اور ایمان پر قائم ہو۔ پھر یہ بات بھی ان کے ذہن نشین کیجیے کہ ان کی تمام معاشی مشکلات اور ان کے ان تمام دکھوں کا جو موجودہ تمدن نے پیدا کر دیے ہیں صرف ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا نظام خالص اسلامی بنیادوں پر قائم ہو"۔ (روداد جماعت اسلامی' حصہ سوم' ص ۱۳۴)

اجتماع اسلام آباد سے نیا جذبہ اور نئی امنگ لے کر تحریک کے کارکن اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں واپس آئے ہیں' ان کی ذمہ داری ہے کہ اب اس پیغام کو اپنے گرد و پیش بھی پوری قوت اور مستعدی کے ساتھ پھیلائیں اور رائے عامہ کو اتنا بیدار اور منظم کریں کہ باطل کی قوت پراگندہ ہو جائے' اسلام اور غیر اسلام کا ہر ملغوبہ حقارت سے رد کر دیا جائے' اسلام کی واضح اور روشن شاہراہ پر چلنے والے ان کے قائد اور رہنما ہوں اور ان کی قیادت میں اسلام کے حیات بخش اور انصاف قائم کرنے والے نظام کو سربلندی حاصل ہو: ؎

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

نفاذِ شریعت : مفہوم اور تقاضے

شریعت سے مراد محض قانون نہیں ہے جس کو عدالتوں کے ذریعے نافذ کیا جائے۔ شریعت قانون کے ہم معنی نہیں۔ شریعت سے مراد زندگی کا پورا نظام ہے جو عقائد و ایمانیات سے شروع ہوتا ہے' اور عبادات و اخلاقیات پر آتا ہے۔

شریعت کے تقاضے

(الف) ایمان کی آبیاری اور پختگی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت ہی کو نافذ کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے' آپؐ نے تیرہ برس مکہ مکرمہ میں' اس کے بعد مدینہ منورہ میں اپنی ساری طاقت صرف فرمائی تھی کہ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں ایمان کی طاقت بٹھا دیں کیونکہ یہ شریعت اس وقت تک نافذ ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس کے چلانے والوں میں ایمان موجود نہ ہو' اور جن پر وہ چلائی جائے ان کے اندر بھی ایمان نہ ہو۔۔۔۔ اگر ایمان موجود نہ ہو تو ممکن نہیں ہے کہ شریعت کو نافذ کیا جاسکے اور ممکن نہیں ہے کہ جس آبادی پر اس کو نافذ کیا جا رہا ہے وہ اس کو برداشت کرلے۔ مثال کے طور پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ حدود شرعیہ میں سے ایک حد شرعی یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس کے اوپر عمل وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان ہو۔ وہ سچے دل سے سمجھتے ہوں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ سچے دل سے یہ سمجھتے ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسولؐ ہیں۔ سچے دل سے یہ مانتے ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی اور کلام نازل ہوا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو رسولؐ کی زبان سے جاری ہو رہا ہے اور سچے دل سے یہ مانتے ہوں کہ اگر ہم نے اس کے نافذ کرنے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کی تو آخرت میں ہمیں اللہ کے روبرو جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اگر یہ چیزیں موجود نہیں ہیں تو حدود شرعیہ کا اجرا ہو نہیں سکتا۔ ممکن ہی نہیں۔

کوئی ایسا فرد جس کو قانون کی شکل میں حد شرعی ملے لیکن وہ اس پر ایمان نہ رکھتا ہو تو وہ پہلی فرصت تلاش کرے گا جس میں اس قانون کو منسوخ کرے اور اپنے لیے نیا قانون بنائے۔ اسی طرح جن لوگوں پر یہ قانون نافذ کیا جاتا ہے اگر ان کے اندر ایمان نہ ہو' وہ یہ نہ مانتے ہوں کہ قرآن برحق ہے اور اسلام کے قانون میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہی ہے' اگر وہ اس کے اوپر یقین نہ رکھتے ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کسی غریب' چھوٹے اور بے اثر آدمی کے تو ہاتھ کاٹ دیے جائیں لیکن اگر کسی بااثر آدمی کا ہاتھ کاٹنے کی نوبت آجائے تو بغاوت برپا ہو جائے۔ وہ آبادی اس چیز کو برداشت ہی نہیں کرے گی کہ یہ قانون نافذ ہو۔ اس لیے شریعت سب سے پہلے جس چیز کا تقاضا کرتی ہے

وہ یہ ہے کہ اس کو نافذ کرنے والے اور جن لوگوں پر اسے نافذ کیا جائے ان کے اندر ایمان ہو' ان کے دلوں میں ایمان ہو۔

(ب) اسلامی اخلاق کا جامع تصور: اس کے بعد دوسری چیز جس کا شریعت مطالبہ کرتی ہے' وہ یہ ہے کہ اسلام جو اخلاقیات دیتا ہے' بھلے اور برے کا جو امتیاز دیتا ہے' خیرو شر کا جو فرق بتاتا ہے اور جو اقدار انسان کو دیتا ہے کہ یہ چیز قیمتی ہے اور یہ چیز بے قیمت ہے' اس کو ٹھیک ٹھیک مان کر سمجھ لیا جائے۔ اگر یہ چیز موجود نہ ہو گی' تو مانتے ہوئے بھی وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے کیونکہ ان میں اخلاق موجود نہ ہو گا۔ اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ لوگ' جن کے اخلاق کو گھن کھا چکا ہو' ان کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ شریعت کو نافذ کریں۔ اس لیے کہ شریعت اسلامیہ قانون کے ساتھ اخلاقیات بھی دیتی ہے اور اخلاقیات کا نہایت وسیع تصور دیتی ہے جو زندگی کے ہر معاملے سے تعلق رکھتا ہے۔

(ج) شریعت کو پوری زندگی پر نافذ کیا جائے: اس کے بعد تیسری چیز یہ ہے کہ شریعت کا نظام انسانی زندگی کے پورے دائرے پر محیط ہے۔ وہ اس بات سے بھی بحث کرتا ہے کہ پانی میں پاک کیا ہے اور ناپاک کیا ہے' اس شے سے بھی بحث کرتا ہے کہ انسان نجس کس حالت میں ہوتا ہے اور کس حالت میں کس طرح وہ پاک ہو سکتا ہے۔ یعنی شریعت کوئی محدود سا قانونی تصور نہیں رکھتی۔ آپ دیکھیے کہ فقہ کی کتابیں باب طہارت سے شروع ہوتی ہیں اور دنیا کا کوئی قانون آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس کے اندر طہارت کے مسئلے سے بحث کی گئی ہو۔ بلکہ حقیقت میں دنیا کی کسی زبان میں طہارت کا ہم معنی لفظ موجود نہیں۔ مغربی ممالک جانتے ہی نہیں کہ طہارت کس چیز کو کہتے ہیں۔ ان کی زبان میں اس کا ہم معنی لفظ موجود نہیں۔ لیکن اسلامی شریعت طہارت سے بحث کرتی ہے جو کہ ایک فرد کا معاملہ ہے اور افراد کے اندر طہارت پیدا کرتی ہے۔ افراد کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرتی ہے۔ افراد کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے آمادہ کرنا' ان کو بندگی کے طریقے سکھانا' یہ شریعت کا کام ہے۔

پھر افراد کو جوڑ کر ایک جماعت بنانا اور اس جماعت کے اندر اسلامی طریقے رائج کرنا' عبادات سے لے کر نکاح کے معاملات تک اور تجارت سے لے کر سیاست اور قانون و عدالت کے معاملات تک' جنگ سے لے کر صلح تک' ملک کی مالیات سے لے کر ملک کی صنعت و حرفت تک ہر چیز کے بارے میں قانون موجود ہے۔ اس چیز کو اگر نافذ کرنا ہے تو آدمی یہ سمجھ لے کہ انسانوں کی پوری زندگی بدل ڈالنا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ صرف ایک پہلو سے ان کی زندگی کو بدلا جائے بلکہ ان کی پوری زندگی کو ہر پہلو سے' افراد سے لے کر جماعت تک' پوری آبادی کو بدلنا ہے۔ ان کے اندر ایمان داخل کرنا ہے' ان کے اندر اخلاقیات پیدا کرنے ہیں' ان کے اندر آمادگی پیدا کرنی ہے کہ خدا کے قانون کی پابندی کریں اور اس کے بعد تمام معاملات کو اس کے مطابق ڈھالنا ہے۔ مارکیٹ میں جو لین دین ہو رہا ہے' اس کے اوپر بھی شریعت کو نافذ کرنا ہے' بنکوں میں جو مالیاتی لین دین ہو رہا ہے ان کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے۔ یہ انشورنس کمپنیاں جو چل رہی ہیں' ان کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا

ہے۔ حکومت جو ٹیکس لگاتی ہے اور ٹیکس لگا کر جس طرح خرچ کرتی ہے ان دونوں چیزوں میں' جو قرض دیتی ہے اور جو قرض لیتی ہے' اور قرض لے کر جس طرح خرچ کرتی ہے' ان سب پر بھی شریعت کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔ عدالتوں میں بھی شریعت کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔

حکومت کے انتظامی شعبوں کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے۔ مثلاً اگر پولیس بے ایمان ہے تو اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک بے ایمان پولیس کے ہاتھ میں اسلامی شریعت دے دی جائے تو وہ پوری آبادی کو نچوا دے گی' تو اس طرح پوری انتظامی پالیسی کو بدلنا ہے' اس کی فوج کو بدلنا ہے' اس کی پولیس کو بدلنا ہے' اس کے تمام حکام اور کارکنوں کو بدلنا ہے۔ رشوت خور لوگ اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

اس طرح سے شریعت کی اس حیثیت کو بھی نگاہ میں رکھیے کہ یہ پوری زندگی کا قانون ہے' کسی ایک پہلو کا نہیں' اور یہ ایمان سے لے کر معاملات کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا تک حتیٰ کہ سڑکوں کی صفائی تک سے بھی بحث کرتی ہے۔ سڑک پر کوئی شخص کانٹے بچھاتا ہے یا لوگوں کو تکلیف دینے والی چیز ڈالتا ہے' کوئی نجاست پھینکتا ہے تو وہ ایک گناہ کرتا ہے۔ ان سارے معاملات پر شریعت حاوی ہے۔

شریعت کے اس حاوی ہونے کے پہلو کو نگاہ میں رکھنے کے بعد اب دیکھیے کہ اس کے نفاذ کا کیا مطلب ہے؟

نفاذ شریعت کا ہمہ گیر مطلب: اس کے نفاذ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے مدرسوں میں بیٹھ کر شریعت کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے نفاذ کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آپ وعظوں اور تقریروں میں اس کو بیان کریں۔ اپنے خطبوں میں اس کو بیان کریں۔ اس کے نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ جو احکام شریعت میں ہیں ان کو پوری طاقت سے نافذ کیا جائے۔ جو کام صدر مملکت کا ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ جو وزیراعظم کے کرنے کا کام ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ جو گورنروں اور صوبے کے وزرا کا کام ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کریں۔ جو مالیات کے محکمے کا کام ہے' جو عدالت کے محکمے کا کام ہے' جو اقتصادیات کے محکموں کا کام ہے' جو صحت و تندرستی کے محکموں کا کام ہے وہ سارے کے سارے شریعت کے مطابق چلیں۔ یعنی کوئی ایک چیز نہیں ہے جو درکار ہو' بلکہ پوری کی پوری حکومت کا نظام' پورے کا پورا تجارت و صنعت و حرفت و اقتصادیات کا نظام' پورے کا پورا عدالتی اور معاشرتی نظام' سب کچھ اس کے مطابق ہونا چاہیے۔ ہر چیز میں اس کو نافذ کرنا چاہیے۔ جو چیز کہ محلے کے لوگوں کے نافذ کرنے کی ہے وہ نافذ کریں۔ جو میونسپلٹیوں کے نافذ کرنے کی ہے وہ نافذ کریں۔ جو چیز قانون ساز اسمبلی کے کرنے کی ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ پوری کی پوری گورنمنٹ اس کے مطابق ہونی چاہیے۔ نہ یہ کہ شیخ الاسلام بنا کر بٹھا دیا جائے یا وزارت مذہبی امور بنا دی جائے اور سمجھ لیا جائے کہ شریعت کا نفاذ ہو گیا۔ یہ کوئی بات نہیں بلکہ پورے کے پورے نظام حکومت کو تبدیل کرنا اور اسلام کے مطابق چلانا ہے۔

اس کا نام ہے نفاذ شریعت! (جمعیت اتحاد العلما کے زیر اہتمام راولپنڈی میں منعقدہ نفاذ شریعت کانفرنس سے خطاب' ہفت روزہ ایشیا' ۱۴ مارچ ۱۹۷۶)

اللھم صل علیٰ محمد

حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا :

میں چاہتا ہوں کہ آپ پر درود زیادہ بھیجا کروں یعنی اللہ تعالیٰ سے آپ پر صلوۃ کی استدعا زیادہ کروں۔ آپؐ مجھے بتا دیجئے کہ اپنی دعا میں کتنا حصہ آپؐ پر صلوۃ کے لیے مخصوص کروں ؟

آپؐ نے فرمایا : جتنا چاہو۔

میں نے عرض کیا : میں وقت کا چوتھائی حصہ آپؐ کے لیے مخصوص کردوں گا۔
آپؐ نے فرمایا: جتنا چاہو،اور اگر زیادہ کردو گے تو تمہارے لیے بہتر ہو گا۔

میں نے عرض کیا: تو پھر آدھا وقت اس کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔
آپؐ نے فرمایا : تم جتنا چاہو کر دو' اور اگر زیادہ کرو گے تو تمہارے لیے بہتر ہو گا۔

میں نے عرض کیا: پھر میں اس میں سے دو تہائی وقت آپؐ کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا: جتنا چاہو کر دو،اور اگر زیادہ کرو گے تو تمہارے لیے خیر ہی کا باعث ہو گا۔

میں نے عرض کیا: پھر تو میں اپنی دعا کا سارا ہی وقت آپؐ پر صلوۃ کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا :اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری ساری فکروں اور ضرورتوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفایت کی جائے گی۔(یعنی تمہاری ساری دینی و دنیاوی مہمات غیب سے انجام پائیں گی)اور تمہارے قصور اور گناہ ختم کر دیئے جائیں گے۔ جامع ترمذی

(خیر خواہ)

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ نے مجھ پر میری امت کے لیے دو امانیں نازل فرمائیں۔ ایک' اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "اللہ تعالیٰ کے لیے مناسب نہیں کہ وہ انھیں عذاب دے اس حال میں کہ آپؐ ان میں موجود ہوں"۔ اور دوسری امان' یہ ارشاد کہ "اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ انھیں عذاب دے اس حال میں کہ وہ استغفار کر رہے ہوں"۔ جب میں چلا جاؤں گا تو امت میں قیامت تک استغفار کی پناہ کو چھوڑ دوں گا۔ (جمع الفوائد' حدیث ۹۰۵۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود بابرکات اپنی زندگی میں امت کے لیے امان تھا اور قیامت تک کے لیے اس طرح سے امان ہے کہ آپؐ کے بعد تاقیامت اس طرح کا عذاب نہ آئے گا کہ قوم کی قوم صفحۂ ہستی سے مٹا دی جائے۔ اللہ کے رسولؐ اپنے بعد ہمیں استغفار کی پناہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ ہم استغفار ترک کر دیں تو یہ پناہ ہٹ جاتی ہے اور ہم مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بارش نہ ہو' قحط پڑ جائے' مالی تنگ دستی ہو' انسانی وسائل کی کمی ہو' اللہ سے استغفار کرو' آسمان سے بارش ہو گی' مال و اولاد سے نوازے جاؤ گے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ انسان استغفار کرے گا تو پھر گناہ سے بچنے کی کوشش بھی کرے گا۔ عذاب کو دعوت دینے والوں گناہوں پر جری نہ ہو گا۔ قتل و غارت اور باہمی انتشار عام ہو تو اجتماعی استغفار کرنا چاہیے۔ اجتماعی استغفار دراصل جماعتوں اور قوموں کی خود احتسابی ہے۔ مستقبل کی راہیں اس سے کشادہ ہوتی ہیں۔ اجتماعی نظام فساد کا شکار ہو' برائیاں عام ہوں تو یہ استغفار کے اثرات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

○

حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے:
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز میں دعا کرتے ہوئے سنا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف بھیجے بغیر دعا شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے جلد بازی کی ہے۔ پھر

سے بلایا اور اسے یا کسی دوسرے کو مخاطب کر کے فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی نماز پڑھے (اور اس کے آخر میں دعا کرنا چاہے) تو پہلے اللہ کی حمد و ثنا کرے' پھر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود شریف پڑھے' اس کے بعد جو دعا کرنا چاہے کرے۔ (جمع الفوائد' حدیث ۹۳۳۶)

دعا اطمینان و سکون سے مانگنا چاہیے اور اس کے آداب کا لحاظ رکھ کر--- اس طرح قبولیت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ دعا مانگنا' سر سے بوجھ اتارنا نہیں ہے' دینے والی ذات سے کچھ مانگنا ہے۔ مانگنے والوں کی طرح مانگنا چاہیے۔ ایک اور روایت کے مطابق' انسان دعا میں درود کی کثرت کرے' دعا کا تہائی' نصف یا کل بھی درود ہو' تو ضروریات تو اللہ کے علم میں ہوتی ہیں' پوری کی جاتی ہیں۔ درود کے بغیر دعا معلق رہ جاتی ہے۔

○

حضرت محمد بن عمیرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اگر ایک بندہ اللہ کی اطاعت میں اپنے چہرے کے بل اپنی پیدائش کے دن سے وفات تک پڑا رہے تو آخرت میں اسے حقیر جانے گا اور آرزو کرے گا کہ دنیا کی طرف واپس آئے تاکہ اپنے اجر و ثواب کو زیادہ کر لے۔ (رواہ احمد' مشکوٰۃ شریف)

یہ آخرت کے دن کا منظر ہے۔ اب عمل کی مہلت نہ ہو گی۔ گزری ہوئی زندگی انسان کے سامنے ہو گی۔ کوئی کس لیے' کوئی کس لیے دوبارہ دنیا میں جانے کی آرزو کرے گا۔ بد' اس لیے کہ اب کے نیکی کر کے آئیں گے' اور نیک اس لیے کہ اب کے اور زیادہ طاعت کریں' تاکہ اور زیادہ اجر سے نوازے جائیں۔ انسان' زندگی غفلت میں گزار دیتا ہے' آخرت کی پروا نہیں کرتا' آخرت میں جا کر دنیا کی اس قدر و قیمت کا اندازہ ہو گا کہ وہاں جو کچھ ملا ہے' اس دنیا کی بنیاد پر ملا ہے۔ بہت زیادہ نیکی کرنے والے' ہر ہر لمحہ اللہ کے لیے گزارنے والے بھی' مزید اجر کے لالچ میں دنیا کی تمنا کریں گے۔

کیوں نہ ہم ابھی اپنی دنیا کو اپنی آخرت کی بیش از بیش کمائی کا ذریعہ بنائیں!

○

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
خرچ میں میانہ روی نصف معیشت ہے۔ لوگوں سے اظہار محبت کرنا نصف عقل ہے اور اچھا سوال نصف علم ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی معاشی حالت اچھی ہو' اس کے کام عقل و دانائی کے مظہر ہوں اور صاحب علم ہو۔ اللہ کے رسولؐ نے ان تینوں مقاصد کے حصول کے لیے نسخہ کیمیا بتایا لیکن یہ اشارہ بھی کر دیا کہ صرف یہی سب

کچھ نہیں' البتہ اس سے نصف منزل سر ہو سکتی ہے۔ تینوں کام' محنت کے کام نہیں' زندگی میں رویے اپنانے کا مسئلہ ہے۔ جس میں یہ رویے نہیں' توجہ دے کر اختیار کر سکتا ہے۔

مالی پریشانیوں کی ایک بڑی وجہ اخراجات میں بے اعتدالی ہے۔ آمدنی حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا' اس میں جائز ناجائز کا خیال رکھنا نیکی' اور آج کل تو' جہاد ہے۔ بقیہ نصف بہتری آدمی اخراجات کے بارے میں میانہ روی کی عمومی روش اختیار کر کے حاصل کر سکتا ہے۔ قومی سطح کے مسئلے کا بھی یہی حل ہے۔

عقل و دانائی ملنے جلنے سے' گفتگو کرنے سے بھی آتی ہے۔ میل ملاپ کے لیے محبت کا اظہار' حسن سلوک اور حسن اخلاق کے رویے ضروری ہیں۔ اس سے دوسرے گرویدہ ہو جاتے ہیں' تعلق جوڑتے ہیں' دکھ درد اور غمی خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔

حصول علم میں سوال کی بڑی اہمیت ہے۔ بات پوچھنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ جو بات سوال کے جواب میں معلوم ہوتی ہے' یاد رہتی ہے۔ کھلی آنکھوں سے مشاہدہ ہو' تو سوال ضرور پیدا ہوتے ہیں۔

○

حضرت علیؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سنو! کوئی بھلائی نہیں ہے اس قرات میں جس میں تدبر نہیں' اس عبادت میں جس میں تفقہ (پورا شعور) نہیں۔ (صحیح معنوں میں) کامل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کرتا اور انھیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوف نہیں کرتا اور قرآن پاک کو بے رغبتی کی بنا پر چھوڑ کر دوسری چیز کو جو اس کی خواہش کے مطابق ہو' نہیں لیتا۔ (جمع الفوائد' حدیث ۴۷۶۲)

قرآن پاک کی تلاوت کا اصل فائدہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں تدبر کیا جائے۔ تدبر کیا ہے؟ اس کے احکام' اخلاق' عبرت آموز قصے' آخرت کی تذکیر' اللہ کی عظمت و جلال' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کا بیان' ان سب کو سمجھنا' ان کو اپنانا' جائزہ لینا' یہ تدبر ہے۔ اسی طرح عبادت کو سمجھ کر ادا کرنا' نماز' روزے' حج اور زکوٰۃ کے مقاصد اور تقاضوں کو سمجھ کر انھیں ادا کرنا تفقہ ہے۔

عبادات بے سوچے سمجھے نہیں' شعور کے ساتھ ادا کرنی چاہییں۔ پوری زندگی عبادت ہے۔ تفقہ یہ بھی ہے کہ قرآن پاک کے مقابلے میں کسی دوسری کتاب' اس کے حکم کے مقابلے میں کسی دوسرے حکم اور اس کے نظام کے مقابلے میں کسی دوسرے نظام کو قبول نہ کیا جائے۔

فقیہ کے پاس لوگ مسئلے پوچھنے جاتے ہیں۔ جو حالات اور سائل کی کیفیت سے بے نیاز ہو کر مسئلہ سنا دے' امکان ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس کر دے' یا اللہ کی پکڑ سے بے خوف کر دے۔ بیم و رجا اصل ایمانی کیفیت ہے۔ ایک اچھا فقیہ مسائل بتاتے ہوئے خیال رکھے گا کہ اس کی تعلیم سے یہی کیفیت پروان چڑھے'

نہ وہ رحمت سے مایوس ہو' نہ پکڑ سے بے خوف ہو جائے۔ یہ دونوں کیفیات بندگی کی راہ میں مانع ہیں۔ مایوس انسان سوچتا ہے کہ جب مغفرت نہیں' تو عبادت کا کیا فائدہ۔ اسی طرح جب پکڑ نہیں ہے تو عبادت کیوں کی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کے احساسات سے محفوظ رکھے' رحمت کی بھی امید دے' پکڑ کا بھی خوف رہے۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کو ضعیف مومن کے مقابلے میں قوی مومن افضل اور زیادہ محبوب ہے۔ اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔ حرص کرو اس چیز کے حصول کی جو تمھیں نفع دے۔ اللہ سے مدد مانگو اور عاجز نہ بن جاؤ۔ اگر تمھیں کوئی مصیبت پہنچے تو یہ نہ کہو: اگر میں نے یوں کیا ہوتا' اس طرح کیا ہوتا تو اچھا ہوتا' بلکہ یہ کہو: اللہ کی تقدیر تھی' اس نے جو چاہا کیا۔ اس لیے کہ "اگر" شیطان کے کام کے لیے دروازہ کھول دیتا ہے۔ (رواہ مسلم)

قوی مومن وہ ہے جو اللہ کی بندگی کی زیادہ قوت رکھتا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اسی لیے محبوب ہے کہ وہ زیادہ بندگی کرے گا۔ اس کی بندگی اپنی کیفیت' مقدار اور دائرے کے لحاظ سے زیادہ ہوگی۔ مومن قوی ہو یا کمزور ایمان کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ کمزور مومن بھی ایمان کے تقاضے اپنی استطاعت کے مطابق پورے کرے گا' لیکن وہ قوی سے پیچھے رہ جائے گا۔ اسی لیے قوی کی فضیلت بیان کرنے کے بعد ضعیف کا حال بھی بیان کر دیا ہے کہ وہ بھی اپنی جگہ فضیلت رکھتا ہے اور اس میں بھی بھلائی پائی جاتی ہے۔

اس حدیث میں بندگی کے کاموں کی حرص کرنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کرنے کی ہدایت ہے۔ عبادت اور نفع کے کاموں کا شوق بھی ہونا چاہیے اور ان کا عزم بھی۔ اللہ کے توکل پر آدمی میدان عمل میں نکل آئے' حالات اور وسائل کی بنیاد پر بے بسی کا نمونہ بن کر نہ بیٹھ جائے۔ یہ نہ سوچے کہ کچھ نہیں ہو سکتا' بلکہ اپنے پاس جو کچھ ہے اسے کام کرنے میں لگا دے۔

ناکامی کی صورت میں یہ نہ سمجھے کہ اس سے غلطی ہو گئی اور تدابیر کی غلطیوں کو بنیاد بنا کر ماضی کے اوراق کھول کر انھی کا مطالعہ کرنے نہ بیٹھ جائے اور ماضی' جو ہاتھ آنے والا نہیں ہے' کے متعلق یہ نہ سوچے کہ ماضی میں اگر یوں کیا جاتا تو بہتر تھا۔ ایسی صورت میں نقصان نہ ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کا "اگر مگر" شیطان کو موقع فراہم کرے گا کہ انسان کو مایوسی کا شکار کر دے۔ اگر کام اجتماعی تھا تو لوگوں کو بحث و مباحثہ میں الجھا کر ایک دوسرے سے دور کر دے گا اور انتشار پھیلا دے گا۔

اجتہاد اور اقبالؒ

ڈاکٹر سید عبدالباری

علامہ اقبالؒ نے اپنے انگریزی خطبات میں شامل چھٹے خطبے میں اجتہاد کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ خطبات ۱۹۳۰ میں لاہور سے' پھر مزید ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ ۱۹۳۴ میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس لندن سے شائع ہوئے تھے۔ اس خطبے کا عنوان تھا: The Principle of Movement in the Structure of Islam (اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول)۔ اردو میں اسے نذیر نیازی نے اس بنا پر "الاجتہاد فی الاسلام" کا عنوان دیا کہ علامہ نے اس مطمح نظر کے ساتھ یہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا کہ اسلام جس نظام حیات سے عبارت ہے اس میں یہ پتا چلانا چاہیے کہ کون سا ایسا اصول ہے جو اسے زندہ اور متحرک رکھتا ہے تاکہ تغیر و انقلاب کی اس دنیا میں جہاں زندگی کو ہر لحظہ نئے نئے احوال و شئون سے مطابقت و موافقت کی ضرورت پیش آتی ہے' وہ اصول جوں کا توں برقرار رہے۔ علامہ کے نزدیک یہ اصول ہے: اجتہاد ـــــ!

علامہ کے نزدیک اجتہاد سے مقصود ہے زندگی کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالتے رہنا' یعنی کردار کی مسلسل تعمیر و تشکیل یا تبدیلی ذات۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر قوم کی ہستی اور بقا کا راز اس کوشش میں مضمر ہے کہ اس کا ایمان و یقین اس سے جس قسم کی زندگی کا متقضی ہے وہ انفرادی و اجتماعی ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس کے مطابق بدلتی رہے۔

علامہ نے اسلام میں اجتہاد کی معنویت اور ناگزیریت کا نہایت فلسفیانہ اور سائنسی انداز سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے مذکورہ خطبے کے آغاز میں اسلام کے اس امتیاز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے بلکہ اس کے برعکس کائنات کو ایک متحرک وجود قرار دیا۔ یہی تحرک خود اسلام کے طرز فکر اور انسان و کائنات کے بارے میں اس کے تصورات کے اندر بھی موجود ہے۔ علامہ کے نزدیک اسلامی نظام فکر میں فرد کو نمایاں اور مرکزی مقام حاصل ہے اور یہی اجتہاد کا نقطہ آغاز ہے کہ اسے کسی مخصوص طبقے یا گروہ تک محدود نہیں کیا گیا بلکہ کچھ شرائط کے ساتھ ہر

مومن و مسلم کو اس کا اختیار دیا گیا ہے خواہ وہ کسی رنگ، کسی نسل یا کسی مقام سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک رنگ و خون کے رشتے کی اہمیت فرد کی ذاتی قدر و قیمت کو ختم کر دیتی ہے اور یہ آدمی کو زمین سے پیوستگی اور قید مقامی تک محدود کر دیتی ہے۔ یعنی فرد کا بنی نوع انسان اور خدا کی پوری کائنات سے رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اجتہاد کے لیے نوع انسانی کی اپنے مزاج، افتاد طبع اور فطرت کے اعتبار سے یک رنگی میں یقین ضروری ہے۔

علامہ کے عہد میں قوم پرستی اور زمین سے غیر معمولی محبت اور علاقائی پندار کا بڑا زور و شور تھا۔ مغرب نے خلق خدا کو اس طلسم کا اسیر بنایا تھا کہ عقیدہ و اقدار کی یک رنگی بے معنی ہے اور انسانوں کو جوڑنے والا حقیقی رشتہ وطنیت کا رشتہ ہے۔ سرعام یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ قومیں اوطان [وطن] سے بنتی ہیں۔ علامہ نے زمین سے استخلاص [نجات] کی آواز اس مومنانہ بصیرت کی بنا پر بلند کی جو انھیں قرآن حکیم سے گہرے تعلق اور رسول اکرمؐ سے شیفتگی کی بنا پر حاصل ہوئی تھی۔

علامہ، اسلامی نظام فکر میں سب سے زیادہ زور توحید پر دیتے ہیں جو انسانوں کو ملوک و سلاطین کے بجائے اللہ کی اطاعت کرنے اور اتحاد عالم اور وحدت بنی نوع انسان کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی توانائی عطا کرتی ہے۔ علامہ کے زمانے میں جمہوریت کا دور دورہ تھا اور شہنشاہیت کے خلاف ہر طرف صدائے بغاوت بلند ہو رہی تھی۔ بدقسمتی سے اس وقت اسلامی ممالک کے اہل فکر و نظر مغرب کے نظریات کے دام میں اسیر تھے۔ اسلام کے اصول ریاست اور نظام قانون کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اسلام میں آزادانہ غور و فکر کی کوئی گنجایش نہیں۔ علما کا ایک طبقہ اگر ایک طرف جہاد کو منسوخ کر چکا تھا تو دوسری طرف یہ لوگ اجتہاد کے دروازے بند کر کے اس کی پہرہ داری اس طرح کر رہے تھے کہ کوئی اسے کھول نہ سکے۔ علامہ کے نزدیک اسلام میں ثبات اور تغیر دونوں کو مناسب مقام حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ایک ایسے نظام زندگی میں جو انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے، یہ خصوصیت ہونا لازمی ہے۔ گو ثبات و تغیر دونوں کے درمیان توازن ایک مشکل امر ہے۔

علامہ کے نزدیک اسلام، انسان کی حیات اجتماعی میں نظم و انضباط کے کچھ دوامی اصول رکھتا ہے تاکہ اس مسلسل تغیر پذیر دنیا میں وہ اپنا قدم مضبوطی سے جما سکے۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے تغیر و تبدل کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ علامہ کے سامنے مغرب کے اندر مسلسل تغیر و تبدل اور باہم متصادم فلسفوں اور نظریوں کی کشاکش اور اس کے درمیان حیات انسانی کی کس مپرسی اور انسان کی تمدنی و معاشرتی زندگی کے شیرازے کی پراگندگی کا منظر تھا۔ دوسری طرف عالم اسلام کے پچھلے پانچ سو سال بھی ذہنی جمود کے تھے۔ وہ شکوہ سنج تھے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت، نہ نگاہ!

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

علامہ کے نزدیک ثبات و تغیر میں توازن کو اگر اسلام میں کسی اصطلاح سے اجاگر کیا جا سکتا ہے تو وہ اجتہاد ہے۔ جس کے لغوی معنی تو ہیں کوشش کرنا، لیکن اصطلاحی مفہوم ہے کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش۔ اس سلسلے میں علامہ اس مشہور حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جو اجتہاد کی حدود و قیود کو متعین کرنے کے سلسلے میں حرف آخر ہے۔

اس کے راوی حضرت معاذؓ بن جبل ہیں جنھیں یمن کا عامل مقرر کرتے وقت حضورؐ نے پوچھا تھا کہ وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کس طرح کریں گے، اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ پہلے قرآن اور سنت رسولؐ سے ہدایت حاصل کروں گا اور یہ دونوں ناکافی ہوں تو خود کوئی رائے قائم کروں گا۔ پھر علامہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ گو اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن جب مذاہب اربعہ قائم ہو گئے تو عملاً اجتہاد کی اجازت کبھی نہیں دی گئی، یا اجتہاد کے لیے ایسی شرطیں لگائی گئیں جن کا پورا کرنا سرے سے محال ہے۔ پھر علامہ اپنے اس تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ روش اس نظام قانون نے اختیار کی جس کی بنیادیں قرآن مجید پر استوار ہیں اور جو زندگی کو متحرک و متغیر قرار دیتا ہے۔ قانون اسلام کو سرتاسر جامد بنانے کی اس روش کے پیچھے جو محرکات تھے، علامہ نے ان کا تجزیہ کیا ہے اور تین تاریخی اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

علامہ نے عباسی عہد میں الہیات اسلامیہ کی گرماگرمی اور بحث و نزاع کے اس طویل سلسلے کا ذکر کیا ہے جس نے علمائے امت کو دو مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، یعنی عقیدہ خلق قرآن۔ عقلیت پرستوں کی آزاد خیالی تشویش ناک تھی، قدیم طرز فکر کے علما نے اس انداز فکر کو اسلام اور ملت کے لیے موجب انتشار تصور کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دانست میں اسلام کے وجود اجتماعی کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ شرعی قوانین کے اندر سختی پیدا کی جائے۔ پھر اس زمانے میں رہبانی تصوف کے نشوونما نے بھی آزادانہ غوروفکر کے خلاف ردعمل پیدا کیا۔ متصوفین نے فقہائے متقدمین کی لفظی حیلہ تراشیوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تھا۔ اس عہد میں تصوف بھی آزاد خیالی ہی کی ایک شاخ تھا اور عقلیت کا حلیف بن کر سامنے آیا تھا۔ ظن و قیاس کی دنیا کی سیر میں لوگ محو ہو گئے اور ریاست، تمدن اور شریعت کے امور سے ان کا تعلق کمزور ہو گیا۔ علامہ نے اس عہد میں اس اندوہناک صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ تصوف میں گم ہو گئے اور حکومت کی باگ ڈور متوسط درجے کے افراد یا بے علم عوام کے

ہاتھوں میں آگئی۔ چنانچہ ان کو مذاہب فقہ کی اندھی تقلید کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ پھر اس عہد یعنی تیرھویں صدی کے وسط میں بغداد تباہ و برباد ہو گیا، چنانچہ سیاسی زوال و انحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکرین نے اپنی ساری کوششیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ مسلمانوں کی حیات ملی یک رنگ ہو جائے تاکہ مزید انتشار پیدا نہ ہو۔ اس غرض سے انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ فقہاے متقدمین نے قوانین شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی، اس کو جوں کا توں برقرار رکھیں۔ لیکن بہ قول علامہ، نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کے نتیجے میں افراد کی ذاتی خوبیاں اور صلاحیتیں معدوم ہوتی گئیں اور وہ تقلید کے عادی اور لکیر کے فقیر ہو گئے۔

معاشرے کی تنظیم اگر فرد کی ہستی کو معدوم بنا دے تو یہ کوئی اچھی علامت نہیں اور یہیں علامہ کے دل میں اجتہاد کی قدر و قیمت اور فضیلت کا احساس بڑھ جاتا ہے جو فرد کو غور و فکر اور محنت و کاوش کا پیغام دیتا ہے اور اسے اپنی خودی کی گہرائیوں میں ڈوب کر زندگی کی تزئین کے لیے گوہرہاے آبدار منظر عام پر لانے کا ولولہ عطا کرتا ہے۔ علامہ کے نزدیک، ماضی کے غلط اور ضرورت سے زیادہ احترام اور تعظیم کا جو رجحان تیرھویں صدی میں سامنے آیا، روح اسلام کے منافی ہے۔ اس صورت حال پر اقبال، ابن تیمیہؒ کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے مذہب ظاہری کے موسس ابن حزمؒ سے ہم آواز ہو کر اجماع اور قیاس کے سلسلے میں بڑی چونکا دینے والی باتیں کیں۔ اس عہد کے اخلاقی و فکری تنزل، ضعف اور فرسودگی کے بالمقابل ان کے خیالات قابل قدر ہیں۔ علامہ نے علامہ سیوطیؒ کے آزادی اجتہاد کے دعوے کا بھی اس خطبے میں ذکر کیا ہے۔ پھر وہ اٹھارویں صدی کے مصلح اعظم محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کا بڑے والہانہ انداز سے ذکر کرتے ہیں کہ ان کی تحریک کے اندر آزادی اجتہاد کی روح کام کر رہی تھی، اگرچہ داخلی طور پر اس تحریک کا مزاج قدامت پسندانہ تھا۔ انھوں نے احادیث کے احترام و فضیلت کو قائم رکھا اور امور قانون میں اس پر مکمل انحصار کیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں عالم اسلام میں ترکی سب سے زیادہ مغربی تہذیب اور مغرب کی عقلیت کی تحریک سے متاثر تھا۔ یہ عقلیت پرستی، مغرب سے ذہنی مرعوبیت اور انجام کار مغرب کی اندھی تقلید میں تبدیل ہو گئی۔ ابتدائی ایام میں جب کہ مصطفیٰ کمال کو کلی طور اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا، علامہ کو ترکی کی عقلیت کی تحریک سے کچھ خیر کی امید وابستہ تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "اگر اسلام کی نشات ثانیہ عزیز ہے، جیسا کہ میرے نزدیک قطعی طور پر ہے، تو ہمیں بھی ترکوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور مذہبی ورثے کی قدر و قیمت کا جائزہ لینا پڑے گا۔ علامہ کا خیال تھا کہ آزاد خیالی کی اس تحریک کو، جو عالم اسلام میں تیزی سے پھیل رہی ہے، یوں روکنے کی کوشش کریں کہ قدیم نقطہ نظر کے ماتحت اس کی صحت مند تنقید ہوتی رہے۔ علامہ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور آگے چل کر جب ترکی جدیدیت و عقلیت کے راستے

پر ازخود رفتہ ہو کر آگے بڑھنے لگا تو عالم اسلام کے ممتاز مفکرین نے اس کی سختی سے گرفت کی۔ برعظیم میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اسماے گرامی اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علامہ نے جس وقت یہ خطبہ ارشاد فرمایا' اس زمانے میں تحریک تحفظ خلافت' عالم اسلام اور خاص طور پر برعظیم میں نقطہ عروج پر تھی۔ خلافت' ملوکیت' جمہوریت اور شورائیت کے بارے میں لوگ اسلام کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ جدید دنیا میں ایک جدید ریاست کے قیام اور نظم مملکت کو چلانے کی اسلام کے اندر اہلیت ہے یا نہیں؟ حریت' مساوات اور حفظ نوع انسانی کے سلسلے میں اسلام کے طرز فکر پر سوالیہ نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔ علامہ کا موقف تھا کہ: "ازروے اسلام' ریاست کا مطلب ہو گا کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ اسی لیے اسلامی ریاست کو حکومت الٰہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں متعدد مفکرین نے اسلامی ریاست کے خدوخال پر روشنی ڈالی اور حکومت الٰہیہ کی اصطلاح ایک معروف و مقبول اصطلاح بن کر سامنے آئی۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس حکومت میں انسان کے روحانی تقاضوں کو فوقیت ہو گی یا طبیعی' مادی اور دنیوی مسائل تک یہ محدود ہو گی۔ اقبال کے مطابق' اسلام نے جدید فکر بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مذہب کی جو سب سے بڑی خدمت انجام دی' وہ اس کی مادہ پرستی پر تنقید ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ مادی کے بحیثیت مادی کوئی معنی ہی نہیں اِلّا یہ کہ ہم اس کی جڑیں روحانی میں تلاش کریں۔ بالفاظ دیگر یہاں کسی ناپاک دنیا کا وجود نہیں' لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے ریاست کے معنی ہوں گے کہ ہماری یہ کوشش کہ جسے ہم روحانی کہتے ہیں اس کا حصول اپنی ہیئت اجتماعیہ میں کریں۔

اقبالؒ نے اپنے خطبے میں ترک وطن پرستوں کی ان کوششوں پر تنقید کی جس کے تحت انھوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کے مغربی نقطہ نظر کو اختیار کر لیا۔ اس نظریے کو اقبالؒ نے غلط اور گمراہ کن قرار دیا۔ اس سلسلے میں اقبال نے وطن پرستی کے نظریے پر بھی سخت تنقید کی ہے بلکہ انھوں نے ایک صاحب بصیرت اہل قلم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: تہذیب جدید کو' جس کی بنا وطنی انانیت پر ہے' انسان کے دور وحشت و بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہیے۔

اقبالؒ اسلامی طرز حکمرانی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے اور منصب خلافت اب کسی فرد واحد کا حق نہیں بلکہ اس منصب کو کسی منتخب مجلس یا افراد کی ایک جماعت کے ذمے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ایک بین الاقوامی نصب العین کی طرف ہمارا ذہن متحرک ہو سکے گا۔ اس خطبے کے ایک حصے میں علامہ' ترکی کے اس عہد کے مقبول شاعر ضیا گوکلپ کے بعض متجددانہ

خیالات پر تنقید کرتے ہیں اور اس کی لغزشوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً ترکی زبان میں نماز' تلاوت قرآن اور عورت کو وراثت میں مرد کے مساوی حق وغیرہ۔ علامہ کو اس وقت ترکوں سے حسن ظن تھا کہ وہ ذہنی بیداری کی دولت حاصل کر چکے ہیں اور خیالی دنیا سے نکل کر عالم حقیقت میں آ گئے ہیں۔ لیکن مغرب کے اثرات نے ترکوں میں تخلیقی صلاحیت کو پنپنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کی ذہنی بیداری کا ترکی مرکز نہ بن سکا اور اسلامی نشات ثانیہ کی شعاعیں حسن البناءؒ اور سید قطبؒ کے مصر' ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور اقبالؒ کے برعظیم اور آیت اللہ خمینی کے ایران سے پھوٹیں اور اعلیٰ درجے کا انقلاب آفریں سرمایہ فکر و خیال منظرعام پر آیا۔

اس خطبے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی یہ شدید آرزو تھی کہ اسلامی قانون کی نشوونما جو صدیوں سے رکی ہوئی ہے' جاری ہو مگر اس کے لیے جو محنت اور کاوش درکار ہے اس کا بھی انھیں احساس ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر مسئلے میں اس روح کو برقرار رکھا جائے جس کا اظہار سیدنا عمر فاروقؓ کی ذات سے ہوا' جو ہر معاملے میں آزادی رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے۔ علامہ' اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ حریت اور آزادی کے نام پر جو تحریک عالم اسلام میں چل رہی ہے وہ تفرقہ و انتشار کی موجب بھی ہو سکتی ہے اور نسلیت و قومیت کے جن تصورات کو اس تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھایا جا رہا ہے' وہ ایک وسیع مطمح نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے۔

علامہ' اس موضوع پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں کہ کیا اسلامی قانون کی از سرنو تعمیر فی الواقع ممکن ہے؟ وہ اس سلسلے میں ایک مغربی مستشرق ہارٹن کی رائے نقل کرتے ہیں کہ: اسلام کی روح بڑی وسیع ہے' اتنی وسیع کہ اس کی کوئی حدود نہیں۔ لادین افکار سے قطع نظر کر لی جائے تو اس نے گردوپیش کی اقوام کے ہر اس فکر کو جذب کر لیا ہے جو اس قابل تھا کہ اسے جذب کر لیا جائے۔ پھر اسے اپنے مخصوص انداز میں نشوونما دیا۔ چنانچہ علامہ' پورے اعتماد سے اعلان کرتے ہیں کہ جونہی فقہ اسلامی کا مطالعہ غائر نگاہوں سے کیا جائے گا اس کے متعلق اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد ہے یا مزید نشوونما کے قابل نہیں رہا۔ اسلامی قانون کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ قرآن مجید کے اس مطمح نظر پر روشنی ڈالتے ہیں جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا ہے اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمح نظر ایسا ہو گا' اس کی روشنی ارتقا کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر علامہ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں' اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔ وہ ماضی کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے قطع نظر نہیں کر سکتی۔ اس کے مصلحین کی ذمہ داری نہایت نازک اور سنگین ہے۔ انھیں اتحاد انسانی

کے نقطہ نظر سے اپنے ضابطہ حیات کو پیش کرتا ہے تاکہ باہم دگر حریف نسلیں اول دولت ایمان سے مالا مال ہوں۔ پھر اس متفرق مجموعے کو ایک ایسی امت میں بدل دیا جائے جس کا ایک شعور ذات ہو۔

علامہ اقبالؒ نہایت فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اور سیاست اسلام نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ ہمارے فقہا کی قانونی ذہانت و فطانت کا مرہون منت ہے۔ اس کا اعتراف فان کریمر نے بھی کیا ہے کہ رومیوں کے بعد عرب ہی وہ قوم تھی جس کے پاس بڑی خوبی اور محنت سے تیار کیا ہوا ایک نظام قانون موجود ہے۔ اقبال کا یہ کہنا تھا کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔ آج آزادانہ غور و فکر اور جدید مسائل میں علما کی اجتہادی کاوشوں سے ان کا یہ تصور حقیقت کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ پھر علامہ نے اسلام کے قانون وراثت کو جو قرآن میں بیان ہوا ہے' نہایت سائنسی اور انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ پھر وہ حدیث اور اجماع و قیاس کے مصالح اور مقتضیات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مسئلہ اجتہاد میں احادیث کی سرتاسر قانونی حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ علامہ' شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں جس سے قانون سازی کے معاملے میں حدیث کی ہر زمانے اور ہر دور میں حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ وہ امام ابوحنیفہؒ کے اصول استحسان یعنی فقہی ترجیح کے اصول کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں' بہ احتیاط مطالعہ کریں۔ پھر وہ ایک نہایت جامع اور فکر انگیز بات کہتے ہیں:

> سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی انجام دی ہے کہ انھوں نے مجرد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کے بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا۔ لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرتؐ نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہو گی جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں۔ پھر یہ ان اصولوں کی حیاتی قدر و قیمت کا پورا پورا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنی فقہ کے بنیادی ماخذ کی از سر نو تعبیر و ترجمانی کر سکتے ہیں۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' علامہ اقبال' ص ۲۶۷)

علامہ اقبالؒ اسلام کے قانونی تصورات میں اجماع کو سب سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں لیکن انھیں افسوس ہے کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس لیے کہ یہ مطلق العنان ملوکیت کے مفاد کے خلاف تھا کہ وہ اجماع کو ایک مستقل تشریعی ادارے کی حیثیت دیتے۔

اموی اور عباسی خلفا کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین ہی کے ہاتھ میں رہے اور اس کے لیے کوئی مستقل مجلس قائم نہ ہو۔ اب بیسویں صدی میں اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہوا ہے اور بلاد اسلامی میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا قیام اسی جانب ایک قدم ہے۔ اس ضمن میں وہ مغربی نقادوں کی اس دراندازی کا ازالہ کرتے ہیں کہ اجماع خود قرآن مجید کا ناسخ ہو سکتا ہے اور یہ وضاحت کرتے ہیں کہ اجماع صحابہؓ سے بھی صرف کسی حکم قرآن کی تجدید یا توسیع مقصود تھی۔ کسی کو قرآنی حکم یا نصوص کے سلسلے میں تنسیخ کا حق کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مملکت میں مجالس قانون ساز میں علما کو ایک موثر جزو کی حیثیت سے شامل کرنے کی علامہ حمایت کرتے ہیں لیکن یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ: "شریعت اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدباب ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ بہ حالت موجودہ' بلاد اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی بہ احتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے"۔ (ایضاً' ص ۲۷۲)

علامہ نے قیاس (قانون سازی میں مماثلتوں کی بنا پر استدلال سے کام لینا) پر گفتگو کی ہے اور اس امر میں آریائی اور سامی ذہن کے فرق کو جن میں ایک مجرد پر اور دوسرا محسوس پر زور دیتا ہے' واضح کرتے ہوئے فقہاے حجاز کی اس کاوش کا اعتراف کیا ہے جو عراقی فقہا کی موشگافیوں اور ان کے اس رجحان کے خلاف کہ معاملات کا محض ایک فرضی اور قیاسی سلسلہ قائم کیا جائے' شدت کے ساتھ احتجاج کی شکل میں سامنے آیا اور جس کی بدولت شریعت اسلامیہ ایک جسد بے روح نہ بن سکی۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے اصول قیاس پر بطور ایک ماخذ قانون جو تنقید کی اس کو بالغ نظری کا ایک نمونہ قرار دیتے ہوئے علامہ رقم طراز ہیں: "مذہب حنفی کے خلاف ان کی یہی تنقید تھی جس نے محسوس کو مجرد کے چنگل سے آزادی دلائی اور جس کی بدولت اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اصول فقہ کی تعبیر و ترجمانی میں زندگی کے حقیقی تنوع اور حرکت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ مذہب حنفی نے ان تنقیدوں سے فائدہ اٹھایا اور اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لی کہ جیسے حالات ہوں اپنی قوت تخلیق سے کام لیتے ہوئے' ان سے مطابقت پیدا کی جائے"۔ البتہ اب حنفی فقہا کے اندر یہ روح مفقود ہے۔ وہ اسلاف کی تعبیرات کو کچھ ایسی دوامی حیثیت دیتے ہیں جیسے شروع شروع میں امام موصوف کے ناقدین نے ان فیصلوں کو دی جو انھوں نے واقعات کو دیکھتے ہوئے کیے تھے۔ آخر میں علامہ اس خیال کو کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے' ایک افسانہ قرار دیتے ہیں جو فقط اس لیے پیدا ہوا کہ اسلامی افکارِ فقہ کی ایک معین صورت اختیار کرتے چلے گئے اور کچھ اس ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ علامہ اس

موقع پر دسویں صدی ہجری کے مفکر سرخسی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

فقہاے متاخرین کو (متقدمین کے مقابلے میں) اجتہاد کے لیے زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ قرآن مجید اور سنت رسولؐ میں تفاسیر و شروح کا ذخیرہ اس حد تک وسیع ہو چکا ہے کہ آج کل کے مجتہدین کے پاس، بہ نسبت سابق، تعبیر و ترجمانی کے کہیں زیادہ سامان موجود ہے (ایضاً ص ۱۷۵)۔

مگر علامہ اس امر میں یہ تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانے کے احوال و ظروف سے فقہ اسلامی کے اندر مطابقت پیدا کرنے کا نام نہیں۔ علامہ بڑے تاسف سے بین الاقوامی سطح پر جو صورت حال ہے اور یورپ نے جس طرح بنی نوع انسان کو گمراہ کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "جس حق و صداقت کا انکشاف عقل محض کی وساطت سے ہو، اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی و تنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا ہے"۔

علامہ کے نزدیک یورپ کے مثالی فلسفے زندگی کا موثر جزو نہ بن سکے اور اپنی تمام فلسفہ آرائیوں کے باوجود یورپ کی حالت یہ ہے کہ اس کی فساد زدہ خودی باہم دگر جمہوریتوں کی شکل میں، جس کا مقصد وحید ہی یہ ہے کہ دولت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینے، اپنے تقاضے پورے کر رہی ہے۔ انسان کے اخلاقی ارتقا میں یورپ سے زیادہ کوئی اور بڑی رکاوٹ نہیں۔ نسل انسانی کے روحانی استخلاص [نجات] کے مداوے اور کائنات کی روحانی تعبیر کے لیے مسلمانوں کو سامنے آنا چاہیے۔ اس کے لیے اجتہاد کو جملہ شرائط اور قیود کے ساتھ روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔

بعض متجددین اجتہاد کے ڈانڈے آزادی افکار سے ملاتے ہیں۔ اقبالؒ مغرب کے آزادی افکار کے دعوے پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں۔ وہ اس مطلق آزادی کو خطرناک سمجھتے ہیں اور اسے ابلیس کی ایجاد قرار دیتے ہیں ۔

جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد — اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد — گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ

بیسویں صدی میں اس حریت فکر کا بڑا چرچا ہے۔ اس کے نتیجے میں نام نہاد مجتہدین کی ایک بڑی جماعت سامنے آئی جس نے اسلام کو بازیچہ اطفال بنا کر رکھ دیا۔ یہ حضرات اجتہاد کی اصطلاح سے کھلونے کی طرح کھیلنے لگے۔ لوگ بڑی معصومیت سے جمود فکر اور تقلید جامد کے خلاف آزادی فکر کی دہائی دینے لگے۔ علامہ اس طرح کے لوگوں سے خبردار کرتے ہیں۔ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ان متجددین پر علامہ کا تبصرہ ملاحظہ ہو ۔

ہے کس کی یہ جرات کہ مسلمان کو ٹوکے حریت افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچہ تاویل بنا کر چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

علامہ آزادی فکر کے خوف ناک نتائج سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے بے لگام تجدد کی شدت سے مذمت کی۔ وہ فکر و تدبر کا سلیقہ پیدا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اقبالؒ ہندی مسلمانوں کے زوال تحقیق اور ذوق تقلید پر بھی نالاں ہیں جو ان کے نزدیک محکومی و غلامی کا نتیجہ ہے۔ اپنی نظم اجتہاد میں وہ ایک طرف افکار عمیق کی نایابی اور حکمت دین سے محرومی پر ماتم کناں ہیں۔ دوسری جانب ان گم کردہ راہ مفکرین پر بھی تاسف ظاہر کرتے ہیں جو مغرب کی غلامی کے نتیجے میں اسلامی عقائد اور نظریات کی غلط تاویلات کرتے ہیں اور اسلام کی صورت مسخ کرنا، روشن خیالی کی دلیل سمجھتے ہیں۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقہ شوق میں وہ جرات اندیشہ کہاں آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبالؒ ایک ایسے مرد ہوش مند کا تصور کرتے ہیں جو اگرچہ تقلید کے آغوش میں پرورش پاتا ہے لیکن اس کی فطرت سے تخلیق اٹھتی ہے اور جو اپنی سادگی کلام کے باوجود یعنی منطق و لغت کی پیچیدگیوں سے محفوظ رہتے ہوئے، دقیق معانی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اقبالؒ چاہتے تھے کہ فکر اسلامی عصر حاضر کے چیلنج کا سامنا کرنے کی کوشش کرے اور کہنہ پیکر میں روح تازہ جلوہ گر ہو۔

دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب

اقبالؒ ایک ایسے صاف نظر اور روشن ضمیر مہدی برحق کے آرزومند ہیں جو تمام گمراہ کن فلسفوں کے بخیے ادھیڑ دے اور فکر اسلامی کو پھر سے عالم گیر مقبولیت کی منزل تک لا کھڑا کرے۔

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار

علامہ اقبالؒ مشرق و مغرب کا تقابل جگہ جگہ کرتے ہیں اور دونوں کی محرومی و کوتاہی کو واشگاف کرتے ہیں۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

36

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کا ہر فرد جنت میں داخل ہو گا مگر وہ جو انکار کرے (یعنی خود جنت میں داخل ہونا نہ چاہے) آپؐ سے پوچھا گیا کہ بھلا انکار کون کرے گا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو میری اطاعت کرے گا جنت میں داخل ہو گا اور جو میری نافرمانی کرے گا اس نے انکار کیا۔ (بخاری ' بروایت حضرت ابو ہریرہؓ)

حضرت مجددؒ کا سیاسی ماحول

پروفیسر عبدالقدیر سلیم

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، جو بعد میں مجددؒ الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے، بلاشبہ برعظیم میں سترھویں صدی عیسوی کی عظیم ترین فکری شخصیت تھے[1]۔ میں نے ان کے لیے "فکری شخصیت" کی اصطلاح استعمال کی ہے حالانکہ عموماً انھیں ایک صوفی اور مذہبی پیشوا کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اگرچہ تذکرہ نگاروں نے جہاں ان کی مذہبی خدمات کا ذکر کیا ہے، وہاں حیات و کائنات اور مذہب و مابعد الطبیعیات کے مشترکہ مسائل پر ان کے نقطہ نظر کی بحث بھی ضرور آئی ہے، تاہم اس پہلو کو وہ اہمیت نہیں دی گئی، جس کا وہ متقاضی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہ استثنائے چند، مسلم فکر و فلسفہ کی تاریخوں میں ان کا نام نہیں ملتا۔ تاہم مسلم فکر کے ایک سنجیدہ طالب علم کو اس باب میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مجددؒ کی اصلاحی مساعی کا دائرہ ہمہ گیر تھا۔ انھوں نے مذہب کے متوازی چلنے والے تصوف کے دائمی دھارے کو، خس و خاشاک اور اسلام کے مزاج کے خلاف آمیزشوں سے پاک کر کے، ایک چشمہ صافی بنانے کی کوشش کی، اور اس سلسلے میں نہ صرف اعمال و وظائف اور معمولات صوفیہ کو سنت نبویؐ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، بلکہ اس کے لیے ایک فکری بنیاد بھی فراہم کی۔ ساتھ ہی اپنے عہد کے سیاسی ماحول کی اصلاح کی بھی نہایت تندہی سے کوشش فرمائی، کیونکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ عوام اپنے بادشاہ کے دین و مسلک کے پیرو ہوتے ہیں۔

حضرت مجددؒ نے مغلوں کا عہد پایا۔ ہندستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر تھا، جس نے ۱۵۲۶ میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح ہندستان میں سلاطین دہلی کا دور ختم ہوا اور مسلمان بادشاہوں کا آخری خاندان برسر اقتدار آیا۔ بابر، جسے چغتائی ترک کہا جاتا ہے، امیر تیمور کی نسل سے تھا۔ یہ لوگ اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے منگول (مغل) تھے، تاہم ۳۰۲ برسوں میں تاتاریوں کی پہلی سی وحشت باقی نہ رہی تھی۔ بابر پڑھا لکھا شخص تھا، علم و ادب کا قدر دان تھا، خود بھی شعر کہتا اور نثر لکھتا تھا۔ یہی حال اس کے بیٹے ہمایوں کا تھا، جس نے اپنی فطری تن آسانی، کچھ نااہلی اور اپنے

حریف شیر شاہ کی زیرکی اور عالی حوصلگی کی بنا پر ۱۵۴۰ میں اس کے ہاتھوں شکست کھائی اور ایران جا کر پناہ لی۔ یہاں تک کہ شیر شاہ کے نااہل جانشین ۱۵۵۵ میں اس سے مقابلے میں دہلی کی سلطنت گنوا بیٹھے اور برعظیم کے بڑے علاقے پر پھر سلطنت مغلیہ قائم ہو گئی۔ مغلوں کے ہندستان پر قابض ہونے کے صرف ۳۸ سال بعد حضرت مجددؒ کی ولادت ہوتی ہے۔

ہمایوں بھی خود صاحب علم اور علم و حکمت اور فنون کا قدر دان تھا۔ اپنے قیام ایران کے دوران اس نے بہت سے ایرانی علما اور امرا سے تعلقات پیدا کر لیے' جو اس کے ساتھ ہندستان آئے۔ ان میں سے بیشتر شیعہ تھے۔ بعض لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ ایران کے بادشاہ' شاہ طہماسپ صفوی نے تقریباً ڈیڑھ سال ہمایوں کی مہمان نوازی اور پھر مراجعت ہند کے موقع پر اس کی مدد اس لیے کی تھی کہ اس کے ذریعے ہندستان میں شیعہ اثرات پھیل سکیں گے۔ اور یہ کہ خود ہمایوں نے بھی شیعہ عقائد اختیار کر لیے تھے۔ اس سلسلے میں اس سے ایک رباعی بھی منسوب کی جاتی ہے' جس میں وہ خود کو "بندۂ اولاد علیؓ" اور حضرت علیؓ کی یاد پر مسرور بتاتا ہے۔ اس کا وزیر' اور اس کے جانشین اکبر کا اتالیق بیرم خان (جس نے اکبر کے ابتدائی عہد میں' جب وہ ایک نوعمر لڑکا تھا' اس کی طرف سے مغل سلطنت کا انتظام کیا)' خود شیعہ تھا۔ اس طرح مغل حکومت کو اپنے ابتدائی دور ہی سے امرا' وزرا' اہل علم و دانش' نیز انتظامی اہل کاروں میں ایک کثیر تعداد میں شیعوں کا تعاون حاصل رہا۔ اس سلسلے میں سادات بارہہ کا ذکر نامناسب نہ ہو گا' جو بہت بعد میں' یعنی اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت میں بھی (جن کے بارے میں عام خیال ہے کہ انھوں نے شیعہ اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی) عروج و اقتدار کے مناصب پر فائز رہے۔ بہرحال' ابتدا ہی سے مغل سلطنت میں ایک شان دار اور مادی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے لحاظ سے ایک پر رونق سلطنت بننے کے جراثیم موجود تھے۔ اکبر' یعنی سلطنت مغلیہ کے بانی کا پوتا حضرت مجدد الف ثانیؒ کا پہلا ہم عصر بادشاہ ہے۔

سلطنت مغلیہ کی علم دوستی اور علم پروری کے باوجود (بیشتر مغل بادشاہ' سلطنت کے بانی بابر کی طرح یا تو خود شعر کہتے تھے' یا شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے اور یہ روایت سلطنت کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر تک قائم رہی)' اور اس امر کے باوجود کہ مغلوں نے ہندستان میں بہت سی ہندو ریاستوں کا خاتمہ کر کے انھیں نام نہاد "اسلامی ریاست" میں شامل کر لیا تھا' ہم دیکھتے ہیں کہ علما اور صوفیا کی بڑی تعداد یا تو سلطنت مغلیہ سے خوش نہ تھی' یا کم از کم ان کا رویہ سرد مہری کا تھا۔ جب ۱۵۲۶ میں پانی پت میں بابر کے ساتھ ابراہیم لودھی کا مقابلہ ہوا تو بابر اور ہمایوں کے ہم عصر بزرگ' شیخ عبدالقدوس گنگوہی بذات خود ابراہیم لودھی کے لشکر میں مقیم تھے۔

ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد یہ گرفتار کیے گئے' اور ان کے ایک یا دو مریدوں کو بھی گرفتار کیا گیا اور

ان کے گلے میں مرشد کی سیاہ پگڑی ڈال کر انھیں باندھ دیا گیا۔ شیخ کو حکم دیا گیا کہ لشکر کے ساتھ پاپیادہ چلیں' چنانچہ اسی حالت میں وہ پانی پت سے دہلی آئے' اگرچہ بعد میں انھیں رہا کر دیا گیا' تاہم اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ کے مریدوں اور معتقدین کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا ہو گی۔

مغل سلطنت اپنی تمام شان و شوکت' علم و فن کی سرپرستی اور جاہ و جلال کے باوجود' ابتدا ہی سے ایک خالص غیر مذہبی حکومت تھی۔ ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ اس کے تمام بادشاہوں میں مے نوشی' لذت کوشی اور نفس پروری' اسراف اور نمود و نمایش' قساوت و بے رحمی' سلطنت و اقتدار کے لیے باہمی چپقلش کی مثالیں ملتی ہیں۔ غرض یہ تھی وہ سلطنت جس کے عین عنفوان شباب میں حضرت مجددؒ کا ظہور ہوتا ہے۔

حضرت مجددؒ نے دو مغل بادشاہوں کا عہد دیکھا' اکبر اور جہاں گیر۔ ان دونوں بادشاہوں کے ادوار کو مزید دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اکبر کا وہ عہد "جب وہ' بقول مورخین علماے اسلام سے دشمن نہ تھا" اور شعائر اسلام کو مٹانے کے درپے نہ ہوا تھا۔ اس کا دوسرا دور وہ ہے "جب بعض علماے یہ 'ز' اور شاید مقتدر ہندو امرا اور ہندو رعایا کے عام تاثرات کے پیش نظر اس کے سر میں یہ خبط سمایا تھا کہ وہ اللہ کا کوئی اوتار یا خاص بندہ ہے' اور اب اس کے ذمے یہ کام ہے کہ وہ ایک نئے مذہب' نئی ثقافت اور نئی تہذیب کی بنیاد ڈالے' جو عوام کو روایتی مذہبوں' خصوصاً اسلام' کے تنگ کوچے سے نکال کر روشن خیالی اور وسیع المشربی کی شاہراہ پر ڈال دے۔

حضرت مجددؒ کے حوالے سے اکبر کے جانشین جہاں گیر کے دور حکومت کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' یعنی سن جلوس (۱۶۰۵) سے ۱۶۱۹ تک جب کہ اس نے حضرت مجددؒ کو دربار میں طلب کیا' اور ۱۶۱۹ سے اس کی موت (۱۶۲۷) تک۔

اکبر کا عہد' حضرت مجددؒ کی جوانی کا عہد تھا۔ وہ اس کے سال جلوس کے آٹھویں سال پیدا ہوئے۔ ان کا لڑکپن' اکبر کی حکومت کا ابتدائی دور تھا' جب وہ مغل سلطنت کو دوبارہ منظم اور مستحکم کرنے میں مصروف تھا' اور اس سلسلے میں اس کی دلچسپیاں اور مصروفیات' عام بادشاہوں جیسی تھیں۔ اس نے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی' بلکہ شاید رسمی تعلیم کے نہ ہونے کے احساس کی بنا پر وہ علما کا ادب کرتا تھا۔ اپنی علمی استعداد کو بڑھانے کے لیے اس کے لیے یہ تو ممکن نہ تھا کہ رسمی طور پر تحصیل علم اور درس میں مشغول ہو جاتا' اس نے اپنے ارد گرد علما اور اہل کمال کو جمع کیا' اور اس طرح اپنے علمی افق کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خیالات غور سے سنتا اور مختلف موضوعات چھیڑ کر ان میں مباحثے کراتا۔ مذہبی علوم سے اکبر کے اس شغف کے نتیجے میں علما اس سے قربت کی خاطر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر تل گئے۔ اس نے "عبادت خانے" کی جو عمارت مذہبی اور متعلقہ سماجی و ثقافتی امور پر بحث و تمحیص کے لیے بنائی تھی' ایک

مستقل مناظرے کا اڈا بن گئی۔ اکبر ان لوگوں سے کچھ ایسا بدظن ہوا کہ اسے اسلام کی صداقت اور حقیت پر یقین نہ رہا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کا رویہ اسلام، اور اہل اسلام کے لیے معاندانہ ہو گیا۔ پہلے تو دربار میں پنج وقتہ نماز کا اہتمام کیا جاتا تھا" اور اب یہ صورت حال ہو گئی کہ کسی کو مجال نہ تھی کہ علانیہ دیوان خانے میں نماز ادا کرے"۔ اکبر کی گمراہیوں، اور اسلام اور اسلامی شعائر سے اس کی کد کی بہت تفصیلات اب سامنے آ چکی ہیں جنھیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان تفاصیل کو محض عبدالقادر بدایونی کے تعصب پر محمول کرنا کسی طرح بھی درست نہ ہو گا، اور یہ بھی کہ اکبر محض ایک "روشن خیال" یا "آزاد خیال" انسان تھا، جسے مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا، صحیح نہیں ہے۔ اکبر نے آخر تک گہرے مذہبی شغف کا ثبوت دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا یہ مذہب اسلام نہ تھا بلکہ ایک طرح سے اسلام کے خلاف عداوت اور بغض کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

اس طرح کے سیاسی ماحول میں حضرت مجددؒ نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا، بیس، بائیس سال کی عمر میں وہ درسیات سے فارغ ہو کر خود سرہند میں تدریس میں مصروف ہو گئے تھے اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ اکبر آباد پہنچے اور وہاں کوئی آٹھ نو سال قیام کیا۔ اس قیام میں انھیں براہ راست حکومت کی پالیسی کا مشاہدہ کرنے اور امرا اور اہل دربار کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ زبدۃ المقامات سے جو حضرت مجددؒ کی پہلی سوانح حیات ہے، پتا چلتا ہے کہ اکبر کے معتمد امرا، ابوالفضل اور فیضی کے ہاں بھی حضرت مجددؒ کا آنا جانا تھا، ابوالفضل ان کی علمیت کا قدر دان تھا۔ لیکن مذہب کے معاملے میں آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ شیخ مجددؒ کی سوانح کے مصنف خواجہ ہاشم کشمی لکھتے ہیں:

> ابوالفضل کا ایک مصاحب مجھ سے کہتا تھا کہ ایک دفعہ تمہارے مرشد (حضرت مجدد) ابوالفضل کی مجلس میں حاضر تھے۔ اس وقت ابوالفضل نے فلسفیوں اور ان کے علوم کی تعریف شروع کی اور اس میں اس طرح مبالغہ کیا کہ علمائے اسلام کی توہین مفہوم ہوتی تھی۔ حضرت شیخ سلمہ اللہ تعالیٰ سے نہ رہا گیا، اور انھوں نے فرمایا کہ امام غزالی قدس سرہ نے رسالہ شریفہ منقذ (المنقذ) من الضلال میں لکھا ہے کہ جن علوم کی ایجاد کا فلسفی دعویٰ کرتے ہیں، ان میں سے جو کام کے ہیں، مثلاً ہیئت، نجوم، طب، وہ انھوں نے قدیم انبیا کی کتابوں اور ان کے کلام سے چرائے ہیں اور جو ان کی اپنی ایجاد ہیں، مثلاً ریاضی وغیرہ، وہ کسی دینی کام کے نہیں۔ ابوالفضل یہ سن کر جوش میں آگیا، اور کہنے لگا، غزالیؒ نے نامعقول بات کہی ہے۔ حضرت شیخ نے اس بات سے بڑا برا مانا، فوراً ابوالفضل کی مجلس سے اٹھے، اور فرمایا کہ اگر اہل علم کی صحبت کا شوق ہے، تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکالنے چاہییں۔ یہ کہہ کر وہ مجلس سے باہر چلے گئے اور پھر کئی روز تک ابوالفضل کے

پاس نہ گئے' حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت چاہی اور انھیں بلا بھیجا"۔

اس کتاب سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے فیضی کی مشہور بے نقط تفسیر سواطع الالہام میں بعض مقامات پر اس کی مدد کی تھی۔ غالباً اسی قیام اکبر آباد میں ابوالفضل یا بعض دوسرے آزاد خیال اہل علم سے نبوت کے معاملے میں حضرت مجددؒ کا اختلاف رائے ہو گیا۔ یہ لوگ بظاہر عقل کو غائی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کافی خیال کرتے تھے اور الہامی ہدایت کی ضرورت کے منکر تھے۔ حضرت مجددؒ نے رسالہ اثبات النبوۃ تصنیف کیا' جو غالباً ان کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کی تمہیدی عبارت میں لکھتے ہیں:

میں نے بعض لوگوں سے مناظرہ کیا' جنھوں نے علم فلسفہ پڑھا تھا' اور کافروں کی کتابوں سے بہرہ یاب ہو کر فضل و فضیلت کے مدعی ہو گئے تھے۔[۲] انھوں نے لوگوں کو گمراہ کیا اور اصل نبوت کے تحقق اور ایک خاص شخص کے لیے اس کے ثبوت میں خود بھی گمراہ ہوئے...

ایسا محسوس ہوتا ہے "ایک خاص شخص" سے حضرت مجددؒ کی مراد اکبر ہے۔ یہاں ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ بادشاہ کے نقطہ نظر اور رجحان کی مناسبت سے بعض اہل علم' نبوت کی حقیقی حکمت کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قیام اکبر آباد اور آگرہ کے دوران حضرت مجددؒ نے زیادہ تر درس و تدریس اور نجی محفلوں میں گفتگو کے ذریعے ہی اپنے متوسلین' شاگردوں اور امراے دربار کو اپنے نقطہ نظر سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ اس مرحلے پر وہ کسی نظریاتی تصادم کے لیے تیار نہ تھے۔ تاہم اس قیام کے تعلقات بعد میں عہد جہاں گیر میں کام آئے۔

اکبر کی اس پالیسی سے نہ صرف علماے حق اور عام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نالاں تھی' بلکہ راسخ العقیدہ امرا اور حکام کے بارے میں بھی یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس کے ہم خیال اور ہم مشرب ہوں گے۔ اگرچہ یہ ناراضی' ایک مطلق العنان اور طاقت ور حکمران کے وزن تلے بے بسی کے ساتھ دبی ہوئی تھی' لیکن کبھی کبھی اس کا ظہور ہو ہی جاتا تھا۔ چنانچہ جب خود اس کے مقرر کردہ "صدر جونپور" ملا محمد یزدی (شیعہ) نے اس کے دشمن اسلام ہونے کا فتویٰ دیا' تو کئی امرا اکبر کے خلاف ہو گئے۔ ان میں محمد معصوم کابلی' میر معز الملک (میر قاضی بنگال)' نیابت خاں' عرب بہادر اور کئی دوسروں نے مسلح بغاوتیں کیں۔ بنگال میں بابا خاں جباری' اور وزیر جمیل کی سرکشی' نیز مرزا محمد حکیم کابلی کی بغاوت کی وجہ بھی اکبر کی حکومت کے خلاف ایک عام فضا ہو سکتی ہے۔ ان مختلف شورشوں سے اکبری حکومت کے خلاف ایک عام بغاوت کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا' اور اسی لیے ۱۵۸۱ کو بعض مورخ اس کے دور کا نازک زمانہ جتلاتے ہیں' جب کہ اس کا سنگھاسن ڈول رہا تھا۔ اس کے لاڈلے اکلوتے اور سرکش بیٹے شہزادہ سلیم نے حالات سے فائدہ اٹھانے میں کسر نہ چھوڑی تھی' اور خود اپنے باپ کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا۔ ابوالفضل نے اس طرح کی شورشوں

کے بارے میں لکھا ہے کہ ہندستان کی خوش گوار فضا اختلاف کے غبار سے آلودہ ہو گئی ہے۔

اکبر اگرچہ ساری بغاوتوں کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا، اور اس نے شہنشاہ کی حیثیت سے بسترِ شاہی پر جان دی، تاہم اس کے بااثر امرا دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ بعض اس کے بیٹے سلیم کو سلطنتِ مغلیہ کا بادشاہ دیکھنا چاہتے تھے، اور بعض اس کے پوتے خسرو کو۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بسترِ مرگ پر اکبر اپنے بیٹے سے بہت زیادہ خوش نہ تھا۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے اس نے باپ کے خلاف کھلی بغاوت کی تھی، اور اس کے ایک چہیتے درباری امیر، ابوالفضل کو قتل کرا دیا تھا، جس کا اکبر کو دلی صدمہ تھا۔

تخت نشینی کی اس کش مکش میں شیخ فریدؒ بخاری نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اکبر کا رضاعی بھائی، خان اعظم مرزا عزیز کوکہ، جو اس کا عزیز دوست اور اہم درباری تھا، شہزادہ خسرو کے حق میں تھا (خسرو، شہزادہ سلیم کا بیٹا، عزیز کوکہ کا داماد بھی تھا)۔ ایک اور اہم درباری امیر راجا مان سنگھ بھی خسرو کا حامی تھا۔ ان دونوں نے اکبر کے آخری ایام میں شہزادہ سلیم کے بیٹے کو تخت دلانے کی بڑی کوشش کی لیکن آخرکار دوسرا گروہ کامیاب ہوا، جو شہزادہ سلیم کے حق میں تھا۔ اس گروہ میں پیش پیش شیخ فریدؒ تھے، جو حضرت خواجہ باقیؒ باللہ کے ارادت مند اور ان کی دہلی کی خانقاہ باقویہ کے کفیل تھے اور انھی کے ذریعے حضرت مجددؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے تھے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ مکتوبات مجددؒ الف ثانیؒ میں سب سے زیادہ خطوط انھی کے نام ہیں۔ شیخ فریدؒ نے شہزادہ سلیم کے حق میں دوسرے امرا کے علاوہ مقتدر سادات بارہہ کی حمایت حاصل کرائی۔ "امرا نے آخرکار فیصلہ کیا کہ حکومت اسی کو دینی چاہیے، جو اس کا قانونی حق دار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر، جسے دوسروں نے اپنا نمایندہ منتخب کیا تھا، شہزادے (جہاں گیر) کے پاس آیا، اور امرا کی طرف سے اسے پیغام دیا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے، بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرعِ محمدیؐ کا تحفظ کریں گے، اور اپنے بیٹے (خسرو) یا اس کے طرف داروں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شہزادے نے ان شرطوں کو پورا کرنے کی قسم اٹھائی اور بہت سے پہرے داروں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو روانہ ہوا"۔

حضرت مجددؒ کو پتا چلا کہ نئے بادشاہ نے اسلام کی حفاظت و نصرت کا عہد کیا ہے، تو فطری طور پر انھیں مسرت ہوئی۔ اس کا اظہار انھوں نے شیخ فریدؒ ہی کے نام ایک مکتوب میں کیا ہے:

آج کہ دولت اسلام کی ترقی اور بادشاہ اسلام کی تخت نشینی کی خوش خبری خاص و عام کے کانوں میں پہنچی۔ اہل اسلام نے اپنے اوپر لازم جانا کہ بادشاہ کے مددگار و معاون ہوں اور شریعت کے رواج دینے اور مذہب کے تقویت دینے میں اس کی مدد کریں۔ یہ فقیر بے سروسامان بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو دولت اسلامیہ کے مددگار گروہ میں داخل کرے اور اس بارے میں کوشش کرے۔

اس خط میں حضرت مجددؒ نے اس مقتدر امیر کو اصلاح حکومت اور حکمراں کی طرف متوجہ کیا ہے کہ دونوں میں گہرا تعلق ہے۔ "بادشاہ کی نسبت جہان کے ساتھ ایسی ہے' جیسے قلب کی بدن کے ساتھ' اگر قلب اچھا ہے تو بدن بھی اچھا ہے' اگر قلب بگڑ جائے تو بدن بھی فساد کا شکار ہو جاتا ہے"۔ نیز یہ کہ گمراہ' جاہل صوفیا اور علماے دنیا (علماے سو) کس طرح امت کے بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں: "آپ کی جناب شریف سے امید ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آپ کو بادشاہ کا قرب پورے طور پر بخشا ہے تو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے رواج دینے میں ظاہر و باطن کوشش کریں گے اور مسلمانوں کو غریبی سے نکالیں گے"۔

نسبتاً متوازن امرا نے جہاں گیر کے حق میں اپنا وزن ڈال کر اسے بادشاہ بنایا' اور حضرت مجددؒ نے اس پر اظہار مسرت فرمایا' تو اس کی حقیقی وجوہ بھی تھیں۔ بادشاہت کے اس نظام میں یہ تو ممکن نہ تھا کہ کسی صالح شخص کو جو نسلاً تخت کا "حق دار" نہ تھا' بادشاہ بنا دیا جائے۔ خسرو' اور سلیم' انتخاب انھی دو میں ہو سکتا تھا اور سلیم اپنے باپ اکبر کی پالیسی سے بظاہر ناراض اور غیر مطمئن نظر آتا تھا' اس لیے اس کے حق میں وزن ڈالا گیا۔ پھر' جیسا کہ اس کی بعد کی کارکردگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال بھی تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے متعدد احکام کے ذریعے مدرسوں' سراے خانوں اور کنوؤں کی تعمیر کا حکم دیا' بعض محصول معاف کیے' داد رسی کے لیے اپنی مشہور "زنجیر عدل" لگوائی' اور اس طرح خود کو ایک عوام دوست' غریب پرور اور عدل گستر بادشاہ کے طور پر پیش کیا۔

حضرت مجددؒ کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کی حکومت ایک شرعی اور اسلامی حکومت بن جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے کئی امرا کے نام مکتوبات لکھے۔ انھی میں سے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں: "اب' جب کہ حکومت کی طرف سے اسلام کے لیے عناد کی پالیسی بظاہر تبدیل ہو گئی ہے' امرا' علما اور اسلام کے عظیم فرزندوں کا فرض ہے کہ قانون شریعت کے نفاذ کی جدوجہد کریں"۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ اکبر کے جانشین جہاں گیر نے اسلام اور شعائر اسلام کے بارے میں وہ معاندانہ روش نہ اختیار کی' جسے اس کے باپ نے رواج دیا تھا' مگر مثبت طور پر اس نے اسلام کے حق میں اپنی مطلق العنان حیثیت کو کہیں استعمال نہیں کیا۔ یوں شریعت اسلامی کے رواج پانے کی آرزو جس کے لیے علماے حق کوشاں تھے' پوری نہ ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اور بادشاہوں کی طرح ایک بادشاہ تھا' جس کے پیش نظر اپنی موروثی سلطنت کے قیام و استحکام اور اپنی ذاتی بقا کے کچھ مصالح تھے۔ اپنی تخت نشینی کے موقع پر اس نے مناسب سمجھا کہ اس گروہ امرا کو استعمال کرے' جن میں کچھ دینی حمیت ہے' اور وہ اکبر کے مذہبی نظریات سے اتفاق نہیں کرتے' لیکن یہ اس کی ذاتی مصلحت اور حکمت عملی تھی۔ نفاذ اسلام کے لیے اس کے دل میں کوئی امنگ اور خواہش نہ

تھی۔ کیونکہ بعد میں اس کے اقوال، تحریریں اور اعمال اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ "سلطان اسلام" دراصل ایک مغل حکمران کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دربار کے بہت سے آداب، جو سراسر غیر اسلامی تھے، جوں کے توں قائم رہے۔ سجدۂ تعظیمی بدستور باقی رہا، دربار کے تزک و احتشام، محلوں کے مسرفانہ اخراجات جوں کے توں قائم رہے۔ اس کی اوباشی اور شراب نوشی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اپنی زندگی سے ہٹ کر نظام حکومت میں بھی کوئی بنیادی تبدیلی کا دور دور پتا نہیں چلتا۔ غیر مسلموں پر جزیہ عائد نہ کیا گیا، زکوٰۃ کا نظام قائم نہ ہوا، عہد اکبری میں برباد کی ہوئی مساجد اسی طرح نوحہ کناں رہیں، گاؤکشی پر پابندی بدستور باقی رہی۔

جہاں گیر نے "آئین اکبری" کو بحال رکھا، گویا دستور حکومت وہی تھا، جو ابو الفضل جیسے ضال اور مضل نے مرتب کیا تھا، اور جس پر اس کے والد ماجد نے اپنے عمل کی مہر ثبت کی تھی۔

جہاں گیر کے بادشاہ ہونے سے کوئی حقیقی سیاسی تبدیلی نہیں آئی۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ "سلطان اسلام" نورالدین جہاں گیر کا دور سیاسی لحاظ سے کسی بھی طرح اکبر سے مختلف نہیں۔ جلد ہی یہ بات ایک واضح حقیقت کے طور پر حضرت مجددؒ پر عیاں ہو گئی۔

حضرت مجددؒ حکومت کی پالیسی سے نہایت دل شکستہ ہو چکے تھے، اور ان کا ذہن اس سلسلے میں نہایت صاف تھا کہ ظواہر کی بعض تبدیلیوں کے باوجود، حکومت کی روح وہی ہے، اور اس کے مظاہر بھی عام مشاہدے کی بات ہیں۔ قابل غور یہ امر ہے کہ اب جس مکتوب کا میں حوالہ دینے جا رہا ہوں، وہ دفتر دوم کے آخری حصے کا مکتوب ہے۔ یہ جہاں گیر کی تخت نشینی کے ۱۰، ۱۲ سال بعد کا زمانہ ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ کے پاس اب اتنے شواہد آ چکے تھے کہ جہاں گیر کی ملک گیری کے بارے میں اب کسی خوش فہمی کی گنجایش نہیں تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> رونق شریعت کی ترقی و رواج، شاہان بزرگ کے حسن انتظام پر موقوف ہے۔ جب سے یہ امر ضعیف ہو گیا ہے، کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبد و مندر تعمیر کر رہے ہیں، چنانچہ تھانیسر میں ایک مسجد اور بزرگ کا مقبرہ تھا، اس کو گرا کر اس کی جگہ ایک بڑا بھاری مندر بنا دیا گیا ہے۔ کفار تو علانیہ اپنی رسمیں بجا لا رہے ہیں، اور مسلمان اکثر احکام اسلامی کے جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکادشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ بڑی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں کوئی مسلمان اس دن روٹی نہ پکائے اور نہ بیچے۔ اور ماہ رمضان میں علانیہ نان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں، مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث کوئی نہیں روک سکتا۔ ہائے افسوس! بادشاہ وقت ہم میں سے ہو، اور پھر ہم فقیروں کا حال اس طرح خستہ و خراب ہو.....

بعض مصنفین نے اس مکتوب کو دور اکبری میں اسلام کی ابتری کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، جو درست نہیں، یہ دور جہاں گیری کے وسط کا خط ہے۔

ان سیاسی حالات میں غالباً حضرت مجددؒ حکومت کی خیر کی طرف تبدیلی اور پیش رفت سے مایوس ہو چکے تھے، تاہم وہ اپنے حلقے میں بااثر لوگوں کو بار بار ترویج شریعت کی طرف متوجہ کرتے رہے، اور اصلاح و تبلیغ کے معروف طریقے پر بھی گامزن رہے۔ اپنے مریدوں اور خلفا کو انھوں نے اکناف سلطنت میں پھیلا دیا (جسے جہاں گیر اپنی توزک میں "مکاری اور فریب کا جال" قرار دیتا ہے)۔ افغانستان، توران، بدخشاں سے لے کر (جہاں اب بھی مجددی سلسلے کا کافی اثر موجود ہے) وسط ہند اور دکن تک حضرت مجددؒ کے خلفا نے عوام کے علاوہ عساکر میں بھی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ کہتے ہیں عبداللہ خان ازبک تورانی (شمال کے علاقے کا حکمران) بھی غائبانہ حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا تھا۔ انھی تبلیغی مساعی اور ان خطوط کی بنا پر جو وہ امرا اور علما کو اکثر لکھا کرتے، اور ان میں تبدیلی اور اصلاح حال کی طرف متوجہ کراتے تھے، غالباً جہاں گیر ان سے کھٹک گیا۔ دکن میں میر نعمان کے ذریعے سلسلہ نقش بندی کی مقبولیت کی بنا پر شاید اس نے فوج میں حضرت مجددؒ کے اثر و نفوذ میں خطرے کی بو سونگھ لی تھی، یا دوسروں نے اسے یہ باور کرایا تھا، بہرحال وہ ان مساعی کو خطرے کا نشان سمجھتا تھا۔ اس نے ان کے مشہور مرید میر نعمان کو دارالحکومت طلب کیا، اور دربار اور لشکر سے علیحدہ نہ ہونے دیا"۔ بعینہٖ یہی سلوک وہ حضرت مجددؒ سے بعد میں کرنے والا تھا۔

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ ہمایوں کے عہد سے ہندستان میں حکومت کے اندر اور باہر بھی شیعی اثرات میں معتدبہ اضافہ ہونے لگا تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی اس میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جہاں گیر کی محبوب بیوی (پہلی بادشاہ بیگم) جس کا نام سکہ پر ڈھالا گیا، شیعہ تھی۔ اس کا بھائی آصف جاہ نہایت بااثر وزیر تھا، اور یقیناً ایرانی شیعی اثرات میں اضافہ ہوا تھا۔ حضرت مجددؒ نے متعدد مکتوبات میں رافضی اثرات میں اضافے پر تشویش کا اظہار کیا ہے (وہ ایک مستقل رسالہ رسالہ در ردِ روافض / کوائف شیعہ) بھی لکھ چکے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ جہاں گیر کو حضرت مجددؒ کے خلاف اکسانے میں یہ عوامل بھی شامل ہوں۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں جہاں گیر نے اپنے ۱۴ویں سال جلوس میں حضرت مجددؒ کو دربار میں طلب کیا اور مختصر سی پوچھ گچھ کے بعد انھیں گوالیار کے قلعے میں اسیر کر دیا، جہاں عموماً سیاسی قیدی نظر بند کیے جاتے تھے۔ (۱۰۲۷ھ/۱۶۱۹ء)

اس سے خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبر کے زمانے کی بہ نسبت اسلام کے حق میں دربار کی فضا کس قدر "ہموار" ہوئی تھی، اور اسلام و شریعت اور مسلم عوام کا درد رکھنے والوں کے لیے حکومت کی پالیسی کیا تھی۔ ان بااثر درباریوں کے ہوتے ہوئے بھی، جن کے ساتھ حضرت مجددؒ کی مراسلت تھی، اور جن کا ذکر

پہلے آ چکا ہے، بادشاہ اس مرد درویش کے ساتھ انتہائی گستاخی اور بدتمیزی کا سلوک کرتا ہے، لیکن مغلوں کی سخت گیر اور منتقمانہ شخصی حکومت کے آگے، جس میں شورش پسند شہزادے تو ایک طرف رہے، باپ بیٹوں اور بھائیوں تک میں عموماً شک و شبہ کی فضا قائم رہتی تھی، کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوئی۔

یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بعض باثر امرا نے مناسب وقت اور موقع تلاش کر کے رہائی کی سفارش کی ہو، اور جب بادشاہ نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ فی الواقع حضرت مجددؒ کے پاس کوئی سیاسی قوت نہیں ہے، یا اگر ہے، تو وہ اسے استعمال نہیں کرنا چاہتے، اور اس طرح وہ اس کی حکومت کے لیے کوئی خطرہ نہیں، تو اس نے کوئی ایک سال بعد انھیں رہا کر دیا۔ اس رہائی کا اندراج بھی توزک میں درج کرتا ہے، لیکن اس کی تحریر کی بیہودگی اور ہتک آمیز زبان سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ ان کا معتقد یا مرید ہو گیا تھا، جیسا کہ ابتدائی تذکرہ نویسوں اور بعد میں انھیں بلا تنقیح نقل کرنے والوں نے لکھ دیا ہے۔

پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں: "جہاں گیر نے انھیں رہا کرنے کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "در رفتن و بودن مختار گردانندم"۔ یعنی میں نے اختیار دیا کہ چاہیں ساتھ رہیں یا چلے جائیں۔ لیکن یہ بات بھی جہاں گیر کی اور کئی باتوں کی (طرح) جھوٹ سے لبریز اور مغلیہ حکمت عملی کا ایک شاہ کار ہے۔ (صرف نظربندی نہیں رکھا بلکہ ان کے مال و اسباب، کتابوں اور جایداد کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ جیسا کہ گرفتاری کے وقت اپنے صاحب زادے محمد معصوم کو لکھے گئے خط سے ظاہر ہوتا ہے، مکتوبات، سوم، مکتوب ۲)۔ اس میں یہ تلقین کی ہے کہ راضی بہ رضا رہیں اور اپنی والدہ سے بھی یہی کہیں۔ یہی نظربندی حضرت مجددؒ کی عظمت کی دلیل اور ان کی شخصیت کے کمال کی دلیل ہے، جسے ارادت مندوں نے اپنی غلطی سے حضرت کے علوشان کے منافی سمجھ کر سو حیلوں بہانوں سے چھپانا چاہا ہے، اور جہاں گیر کو حضرت کا مرید ظاہر کر کے ان کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔" لیکن اس بات کو نظرانداز کر گئے ہیں کہ جہاں گیر کے مزاج میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ آخری دم تک شراب کا رسیا اور عیش و عشرت کا دل دادہ رہا ہے، اور ہمیں اس کی زندگی میں نقش بندی مرید کے کوئی واضح آثار نہیں ملتے، اور ان آثار کی عدم موجودگی میں اسے حضرت کا مرید خاص قرار دینا، ایک طرح سے حضرت کے فیض اور تصرف باطنی کا انکار کرنا ہے، جو تاریخی شواہد کی روشنی میں محل نظر ہے"۔ تاہم پروفیسر فرمان، اس معاملے میں شیخ محمد اکرام کے ہم نوا ہیں کہ "ان تین چار سالوں میں (جب حضرت مجددؒ اس کے لشکر کے ہمراہ تھے) جہاں گیر کو ترویج شریعت کا خاص خیال رہتا تھا، اور اس کے دل میں مذہب کا بڑا جوش تھا۔ عجب نہیں کہ اس میں حضرت کی تعلیمات کا بھی دخل ہو""[۱]۔

"ترویج شریعت" اور "مذہب کے جوش" کے سلسلے میں شیخ اکرام نے توزک سے دو مثالیں درج کی ہیں۔ ایک علاقہ راجوری (کشمیر) کے مسلمانوں کی بعض رسوم کے بارے میں جہاں گیر کے اظہار خیال کی،

اور دوسری کانگڑہ کے قلعے میں شعار اسلام بجا لانے کی۔ راجوری کے مسلمانوں کے بارے میں کہتا ہے:

"باوجود مسلمان ہونے کے ہندوؤں جیسی رسوم بجا لاتے ہیں۔ عورتوں کو خاوند کے مرنے پر قبر میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ ایک بارہ سالہ لڑکی کو اس کے بارہ سالہ خاوند کے مرنے پر اس کے ساتھ زندہ دفن کر دیا گیا۔ لڑکی پیدا ہونے پر اس کا گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں.... ہندوؤں سے بھی رشتے داریاں کرتے ہیں۔ لڑکیاں لینا تو ٹھیک ہے لیکن لڑکیاں دینا لعنتی کام ہے۔ میں نے حکم دیا کہ آیندہ اس رواج پر عمل نہ کیا جائے"[۱]۔

شیخ محمد اکرام اور پروفیسر فرمان کے اس نظریے کی تائید میں کہ جہانگیر کو ترویج شریعت کا خیال پیدا ہو گیا تھا، ۱۴ ویں سال جلوس کے بعد کی پوری توزک دیکھ جایئے، کہیں اقامت صلوٰۃ، ایتاے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کے لیے ادارے قائم کرنے یا ان کے لیے دل سوزی کا ایک حرف نہیں ملتا۔ سونے چاندی میں تولنے، جشن منانے، سیروشکار، تفریح، خیرات و صدقات (جو جاہل اور بدعقیدہ بھی اپنی جان، مال اور اقبال کی حفاظت کے خیال سے دیتے ہیں، کیا مسلم اور کیا غیرمسلم)، حتیٰ کہ اپنے متعدد اوقات میں فصد کھولنے اور پرندوں اور جانوروں کی دوستی اور جنسی محبت تک کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے، لیکن نہ اس نے خود، اور نہ میرزا محمد ہادی نے جس نے بادشاہ کی عدیم الفرصتی / کمزوری کے باعث، اس کے ۱۹ ویں جشن نوروز کے بعد روزنامچے میں اندراجات کیے ہیں، حکومت کے دستور کو (جو بدستور آئین اکبری پر استوار تھا) بدلنے اور اسے اسلامیانے کے کسی اقدام کا ذکر کیا ہے۔ اس کے روزنامچے میں جو "معاذ اللہ"، "نعوذ باللہ"، "اللہ تعالیٰ"، "واللہ اعلم بالصواب" جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ بلااستثناے مذہب اس عہد کے تمام فارسی بولنے والوں میں مروج تھے اور ایک "تہذیبی تقاضا" تھے۔ حتیٰ کہ جدروپ سنیاسی بھی، جس سے ملاقات کا اسے بار بار اشتیاق ہوتا ہے، اور "اس کے کنج عزلت میں بیٹھ کر" وہ "حقائق و معارف پر مبنی بہت ہی اعلیٰ گفتگو" سنتا ہے، بادشاہ کے رخصت ہوتے وقت کہتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اس نے آپ جیسے انصاف پرور بادشاہ.... کی بدولت مجھے اطمینان خاطر کے ساتھ عبادت میں مشغول رہنے کی آسانی عطا کی...."[۱۹]

اسی طرح دوسرے "اسلامی شعائر" کے ساتھ بھی اس کی روش بڑی روایتی قسم کی ہے۔ دسویں سال جلوس کے واقعات میں وہ تفصیل سے ۱۵ سال کی عمر میں شراب نوشی کی ابتدا اور پھر اس میں بے تحاشا اضافے کا ذکر کرتا ہے کہ: "دن رات میں چودہ پیالے (۶ سیر) پی جاتا تھا، بعد میں اس میں افیم کا اضافہ بھی ہوا (کہ سرور میں مزید اضافہ ہو)۔ پھر حکیم کے زور دینے پر تدریج کی، اور اب "البتہ جمعرات کے دن دو وجوہات سے رات کی بجائے دن ہی کے آخری حصے میں پی لیتا ہوں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ جمعرات کی رات ہفتے میں سب سے مبارک رات ہوتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگلا دن مبارک جمعہ ہوتا ہے.... کچھ اچھا

نہیں لگتا کہ اس رات کو یاد الٰہی میں مشغول ہونے کی بجائے عیش و عشرت میں پڑ کر غفلت میں بسر کروں۔ میں جمعرات اور اتوار کے دن گوشت بھی نہیں کھاتا۔ جمعرات کے دن تو اس لیے کہ اس دن میری تخت نشینی ہوئی تھی، اور اتوار کے دن اس لیے کہ میرے والد بزرگوار کا یوم ولادت ہے، اور وہ اس دن کا بہت احترام کرتے تھے....."[۱۷]

وہ خود شراب پینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ "شہنشاہ اسلام" "امر بالمعروف کا فریضہ" اس طرح انجام دیتا ہے کہ اپنے چہیتے شہزادے کو زبردستی شراب پلواتا ہے، اور وہ بھی جمعہ کے دن تاکہ "ترویج شریعت" اس مبارک دن سے شروع ہو۔ لکھتا ہے: "جمعہ ۲۵ ماہ دی کو خرم بیٹے کو تلوانے کی محفل منعقد ہوئی۔ اس دن تک، جب کہ وہ اپنی عمر کے ۲۴ ویں سال میں داخل ہو گیا تھا، کئی بیویوں کا شوہر اور متعدد بچوں کا باپ ہو چکنے کے باوجود اس نے شراب چکھی تک نہ تھی۔ میں نے اس مجلس میں اس سے کہا کہ بیٹے، تو اب خیر سے صاحب اولاد ہو گیا ہے، اس لیے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمیشہ شاہوں اور شہزادوں نے شراب پی ہے، آج کہ تجھے تولنے کے جشن کا دن ہے، میں تجھے شراب پلاتا ہوں، اور تجھے اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے ایام، نوروز کے دنوں اور بڑی بڑی مجلسوں میں پی لیا کرنا..... غرض کہ بہت اصرار کر کے اسے شراب پلائی گئی"[۱۸]۔

توزک کے تتمہ نویس کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ جہاں گیر نے آخری شے جو موت سے پہلے حلق سے اتاری، وہ شراب ہی تھی"۔ اس سے پہلے اس کے ایک چہیتے شہزادے پرویز کی موت بھی کثرت شراب نوشی سے ہو چکی تھی۔ یہ شہزادہ، خرم (شاہ جہاں) کے مقابلے میں جہاں گیر کا زیادہ معتمد علیہ تھا"۔ ۳۸ سال کی عمر میں مرگی اور ترک غذا کے باعث اس کی موت ہوئی۔ "یہ مرض کثرت شراب خوری سے لاحق ہوا"[۱۹]۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی اور سیاسی طور پر اکبر اور جہاں گیر کی پالیسی میں سوائے اس کے کوئی اور فرق نظر نہیں آتا کہ اکبر میں منافقت کم تھی، اور اسے تصوف و مذہب سے ایک خاص طرح کا شغف تھا (اسلام سے نہیں) اسلام کی جگہ لینے کے لیے اس نے ایک نئے مذہب کو ایجاد کرنے کے ناکام تجربات کیے، اور آبادی کے ایک خاصے بڑے طبقے کو ناراض کر لیا۔ جہاں گیر نے ان باتوں کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسے اسلام کے روایتی ثقافتی ورثے سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، کہ وہ کہیں رمضان، شب برات، محرم اور عید الاضحیٰ کی قربانی کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ اگرچہ حضرت مجددؒ کو آخر کار رہا کر دیتا ہے، لیکن اپنی حکومت کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ماضی میں بعض درویش اور ان کے متوسلین حکومت کے لیے پریشانیوں کا باعث بنتے رہے ہیں، اس لیے "اختیار" کے باوجود وہ نہایت عیاری سے انھیں لشکر میں ساتھ لیے پھرتا ہے۔

قید سے رہا ہونے کے کچھ عرصے بعد حضرت مجددؒ نے ایک خط جہاں گیر کو لکھا تھا، جس میں جنگی لشکر

کے مقابلے میں "لشکر دعا" کی فتوحات کو حقیقی فتوحات بتایا تھا۔ وہ متعدد مکتوبات میں اس لذت الم کا ذکر کرتے ہیں' جو اب لشکر ہی قید کی صورت میں درپیش ہے۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے! اپنے بچوں کے نام ایک مکتوب میں وہ بادشاہ کے ساتھ ایک مجلس کا تذکرہ کرتے ہیں' جہاں انھوں نے بادشاہ کے سامنے اسلام کے بنیادی عقائد' بعثت انبیا' عقل کے عدم استقلال' آخرت' ختم نبوت وغیرہ بیان کیے۔ بادشاہ ساری باتیں غور سے سنتا رہا' اور بظاہر چہرے پر ناگواری یا عدم قبولیت کے آثار نہ ظاہر ہوئے۔ تاہم بادشاہ کا اختلاف نہ کرنا' محض اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ درباریوں کے سامنے کسی بحث میں الجھنا اور اکبر کے دربار جیسا سماں پیدا نہ کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنی توزک میں' جہاں متعدد ہندو فقیروں اور یوگیوں سے ملاقات کے اشتیاق' ملاقات کے احوال' اور گفتگو کی تفصیلات دی ہیں' اس مجلس' یا ایسی کسی مجلس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

حضرت مجددؒ نے جن عقائد اور ایمانیات کا تذکرہ کیا ہے' وہ مسلمانوں کی اکثریت میں تقریباً متفق علیہ ہیں' ان پر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہ تھا کہ جہاں گیر نفاذ اسلام کے لیے حضرت مجددؒ کے نظریات سے ہم آہنگ ہو گیا تھا' یا دوسرے مختلف فیہ مسائل میں ان سے متفق تھا۔ حضرت مجددؒ نے بادشاہ کے ساتھ مجلس کے ذکر میں یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے بادشاہ کو جزیہ عائد کرنے' اسلامی قوانین کو نافذ کرنے اور ریاست کی ہیئت کو تبدیل کرنے کے بارے میں بھی کچھ کہا۔ ان میں سے بعض امور کی طرف وہ امرا کو بار بار متوجہ کرتے رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت مجددؒ اور جہاں گیر سے متعلق تاریخ کے بنیادی مصادر میں ایسا مواد نہ ہونے کے برابر ہے' جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ حضرت مجددؒ کے زیراثر جہاں گیر نے مغل سلطنت کی ہیئت ترکیبی میں کوئی بنیادی تبدیلی کی ہو' ہندوؤں کے اثر و اقتدار کو توڑنے کی کوئی شعوری کوشش کی ہو' یا اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات کیے ہوں۔ چنانچہ جب ۱۶۲۴ میں حضرت مجددؒ نے وفات پائی تو مغل سلطنت اسی طرح ایک غیراسلامی اور غیرمذہبی مغل سلطنت تھی' جس کا سربراہ ایک پیدائشی مسلمان تھا' جسے نفاذ اسلام کے بجائے استحکام سلطنت سے دلچسپی تھی' چاہے اس کے دست و بازو ہندو ہوں یا مسلمان' اور یہ کام ہندوؤں کے خون کی قیمت چکا کر کیا جائے یا مسلمانوں کے۔ ان حالات میں حضرت مجددؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عوام و خواص کو اسلام کے چشمہ صافی کی طرف بلایا' اور اس کے اثرات یقیناً محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

حضرت مجددؒ کی وفات کے تین سال بعد جہاں گیر کا انتقال ہوا (۱۶۲۷) تو امرا کی مشاورت کے ساتھ شہزادہ خرم (شاہ جہاں) تخت نشین ہوا۔ بعض سوانح نگاروں کے مطابق وہ حضرت مجددؒ کا پہلے ہی سے معتقد تھا [۲۴] اور غالباً آپ سے بیعت ہو چکا تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے آپ کے صاحب زادے خواجہ محمد معصوم سے تجدید بیعت کی۔ اس نے بعض بدعتیں' سرکاری احکام کے ذریعے ختم کرائیں' [۲۵] سکے پر کلمہ طیبہ کی مہر

جاری کی، تین لاکھ مساجد اور ایک لاکھ مدرسے تعمیر (یا مرمت) کرائے۔ علما و فقرا کے وظائف مقرر کیے اور دین اسلام کی ترویج کی بہت کوشش کی"۲۳۔ سکے پر کلمہ طیبہ کا اندراج، گویا حکومت کے کلمہ پڑھ لینے کے مترادف تھا۔ کہتے ہیں کہ مغرب کی اذان سن کر عجلت میں سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ پیر رپٹا، اور یوں اس کا انتقال ہوا، جب کہ والد محترم کثرت شراب نوشی کا شکار ہوئے تھے۔

شاہ جہاں کے بعد اس کے بیٹے محی الدین اورنگ زیب عالم گیر (حکومت ۱۶۵۸-۱۷۰۷) نے سلطنت سنبھالی۔ روایت کے مطابق وہ بھی خواجہ محمد معصوم کے معتقد اور ان سے بیعت تھے"۲۴۔ ان کے دور حکومت کو سارے مغل عہد میں سب سے زیادہ "اسلامی" کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بادشاہی میں درویشی اختیار کی، ذاتی زندگی میں سادگی کو شعار بنایا، احکام شرع کو قانوناً رواج دیا، اور اس کے لیے فتاوی عالمگیری مرتب کرائی۔ تاہم ان کے جانشین نالائق نکلے، اور سلطنت مغلیہ اس سنہرے دور کے بعد زوال پذیر ہوتی گئی۔

تاریخ کے اس عہد میں، جسے ایک لحاظ سے "بادشاہوں کا زمانہ" کہا جا سکتا ہے، حضرت مجددؒ کسی جمہوری سیاسی تحریک کے ذریعے اصلاح نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے موجود اداروں کے ذریعے بیعت و ارشاد، تعلیم و تربیت اور اصلاح و تجدید کی کوشش کی۔ اور اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ برصغیر کو ایک غیر مسلم ملک بننے سے بچالیا۔ اقبال نے درست ہی کہا ہے:

گردن نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار[۲۵]

حواشی

۱۔ حضرت مجددؒ ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء میں وفات پائی۔ اس طرح قمری تقویم کے مطابق آپ نے ۶۳ سال کی عمر پائی اور شمسی تقویم کے مطابق ۶۰ سال کی۔

۲۔ بدایونی، ملا عبدالقادر، منتخب التواریخ، ص ۳۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۴۔ محمد ہاشم کشمی: زبدۃ المقامات (ترجمہ: مطبوعہ نول کشور) ص ۱۳۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۶۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ابوالفضل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

۷۔ Cambridge History of India، ج ۳، ص ۱۵۰

۸۔ مکتوبات دفتر اول، رقم ۴۷ (۱: ۴۷)

۹۔ ایضاً، ۱: ۴۷

۱۰۔ ایضاً، ۲: ۹۲

۱۱۔ شیخ محمد اکرام نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حضرت مجددؒ کے ایک پرجوش مرید اور مبلغ، شیخ بدیع الدین، حضرت کی دربار میں طلبی اور پھر قید کا باعث ہوئے۔

۱۲۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قلعہ گوالیار سے رہائی کے بعد بھی جہاں گیر حضرت مجددؒ کو اپنے دربار اور "لشکر" میں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا، کہ کہیں پھر "شورش عوام" کا باعث نہ بنیں۔ اور وفات سے صرف چند ماہ قبل ہی انھیں بقول ان کے "گرفتاری لشکر" سے رہائی نصیب ہوتی ہے۔

۱۳۔ پروفیسر محمد فرمان: حیات مجدد، مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۸، ص ۳۵-۳۶

۱۴۔ پروفیسر محمد فرمان، ۳۶، شیخ محمد اکرام ۲۷۳

۱۵۔ توزک جہاں گیری، ص ۱۵۱

۱۶۔ توزک، ص ۵۲۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۷-۳۲۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۶-۳۲۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۵۳

۲۰۔ شاہ جہاں سے ناراض ہو کر وہ اسے "بے دولت" کا خطاب دیتا ہے، ایضاً ۷۲۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۳۸، نیز ۸۳۳

۲۲۔ سید زوار حسین شاہ: حضرت مجدد الف ثانی، ص ۲۱۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۷۰۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۷۰۷

۲۵۔ بال جبریل، پنجاب کے پیرزادوں سے، ص ۱۵۹

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی

پوسٹ بکس 1485 - اسلام آباد

داخلہ برائے تربیت ائمہ کورس نمبر ۴۱

دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اندرون و بیرون ملک تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اکیڈمی دیگر پروگراموں کے ساتھ ائمہ مساجد کی تربیت کا سہ ماہی کورس گذشتہ بارہ برس سے منعقد کر رہی ہے جس میں تفسیر' حدیث' فقہ' عربی زبان' تقابل ادیان اور حالات حاضرہ کے علوم کی تدریس کے فرائض ان کے ماہرین انجام دیتے ہیں۔ کورس کے لیے منتخب ائمہ مساجد کو دوران تربیت مفت طعام و قیام اور درسی کتب کے علاوہ ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

تربیت ائمہ مساجد کا اگلا کورس ۲۵ جنوری ۱۹۹۹ء سے شروع ہوگا جس کے لیے مساجد کے امام اور خطیب حضرات سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

شرائط داخلہ

1- درخواست دہندہ کسی دینی مدرسہ کا فارغ التحصیل ہو۔
2- کسی مسجد میں امام یا خطیب ہو۔
3- عمر کی حد 25 سال سے 40 سال ہو۔
4- منتخب حضرات کو تین ماہ مسلسل اکیڈمی میں حاضر رہنا ہوگا۔
5- سرکاری ادارے سے تعلق رکھنے والے حضرات اپنے محکمہ کے توسط سے درخواست ارسال کریں۔
6- درخواست میں درج ذیل معلومات لازماً تحریر کی جائیں۔

(1) نام معہ ولدیت (2) تاریخ پیدائش (3) مکمل پتہ (4) تعلیمی اسناد کی مصدقہ نقول (5) مسجد سے وابستگی کا سرٹیفکیٹ (6) شناختی کارڈ کی مصدقہ نقل (7) دو عدد پاسپورٹ سائز تصاویر۔

درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ 15 نومبر 1998ء ہے۔ حتمی شرکاء کورس کا انتخاب متعلقہ سلیکشن کمیٹی کرے گی۔

انچارج تربیت ائمہ کورس

دعوۃ اکیڈمی' بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی (فیصل مسجد)

اسلام آباد فون : 3-858640 فیکس : 51-92-261648

خواتین کی دینی خدمات کا دائرہ

نوراکینہ قاضی

قرآن پاک میں اشاعت و اقامت دین کے سلسلے میں مرد و عورت دونوں کو یکساں جدوجہد کی دعوت دی گئی ہے اور ان پر انفرادی فرائض عاید کیے گئے ہیں۔ جہاں کہیں انھیں مخاطب کیا گیا ہے یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یا یَاَیُّهَا النَّاسُ کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص روا نہیں رکھی گئی۔ قبول اسلام کے بعد مرد و عورت شعائر اسلام پر عمل پیرا ہونے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی میں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ارشاد باری ہے: اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (آل عمران ۳: ۱۹۵) ’’میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں‘ خواہ مرد ہو یا عورت‘‘۔

کوئی بھی ایک دوسرے کا نجات دہندہ نہیں بن سکتا: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام ۶: ۱۶۴) ’’کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا‘‘۔ مرد و عورت بھی ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے‘ اپنی نیکیاں ایک دوسرے کو منتقل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی کسی کے کام نہیں آسکتا۔ ہر کوئی اپنی نیکیوں اور گناہوں کا خود ذمہ دار اور انفرادی طور پر جواب دہ ہوگا۔ جیسا کہ معروف حدیث پاک ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پھوپھی اور بیٹی سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ: ’’اے میری پھوپھی صفیہؓ اور اے میری بیٹی فاطمہؓ تم اپنے طور دوزخ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرو۔ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے تمھاری نجات کے لیے کچھ نہیں کر سکتا‘‘ (یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے میری تم سے رشتے داری کسی کام نہیں آسکتی)۔

مطالعہ قرآن کے دوران جہاں جہاں مسلمانوں کو یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے جس کا ترجمہ ’’اے لوگو‘ جو ایمان لائے ہو‘‘ ہے‘ اسے پڑھتے ہوئے عموماً سمجھا جاتا ہے کہ اللہ کے مخاطب صرف مسلمان مرد ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں مسلمان مرد و عورت دونوں کو اکٹھے مخاطب کیا ہے۔ اس لیے اس ناقص فہم سے بھی نجات حاصل کر لینی چاہیے کہ اقامت و اشاعت دین کا فریضہ صرف مردوں ہی پر عاید ہوتا ہے‘ عورتوں پر نہیں۔ عورتوں پر بھی دینی فرائض کی ادائیگی اور اقامت و اشاعت دین کی ذمہ

داری عاید ہوتی ہے۔ مرد و عورت دونوں سے ان معاملات کے بارے میں آخرت میں باز پرس ہوگی۔ جس طرح مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا ہے اور ان پر ان کے اور ان کے بچوں کے نان و نفقہ اور دیگر ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، اسی طرح عورتوں میں دینی علوم کی اشاعت و تربیت کا ذمہ دار بھی انھیں ہی قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں واضح طور پر ارشاد ہے: **قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا** (التحریم ۶۶:۶) "اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ"۔ ظاہر ہے نار جہنم سے بچاؤ، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی، اس کے خوف و خشیت، دینی احکام کی بجاآوری اور دینی فرائض کی ادائیگی سے ہی ممکن ہے۔ مرد و عورت دونوں اگر آخرت کی جواب دہی کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی زندگیاں قرآن و حدیث کی راہنمائی میں مومن بن کر بسر کریں اور اپنی اولاد کو بھی اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں تو ان کے لیے دونوں جہانوں کی سرخروئی ہے۔

اولاد کے معاملے میں دینی تربیت کی ذمہ داری مردوں سے زیادہ عورتوں پر عاید ہوتی ہے، اس لیے کہ بچے باپ سے زیادہ ماں کے قریب ہوتے ہیں۔ عورتوں کا کام صرف گھر گرہستی سنبھالنا نہیں بلکہ ان کی اصل ذمہ داری آیندہ اٹھنے والی ایک عظیم قوم کی نوزائیدہ نسل کی نگہبانی و سینچائی ہے جو ہر گھر میں لہلہا رہی ہے اور انفرادی توجہ اور اچھی تعلیم و تربیت کی مستحق ہے۔ ایک ماں اپنی مشفقانہ خبر گیری، عمدہ نگہداشت اور صالح تربیت سے اپنی اولاد کے اندر بہترین اخلاق، محنت کی عادت، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فکر پیدا کر سکتی ہے۔ ہوش مند مائیں اپنے بچوں کو جن باتوں کی تلقین کرتی ہیں، ان کا سختی سے خود بھی اہتمام کرتی ہیں۔ چنانچہ ماؤں کے پیہم عمل صالح کے نتیجے میں بچوں کے اندر ان کی سکھائی ہوئی باتوں کی صداقت کا یقین بیٹھتا چلا جاتا ہے اور ان کی عمدہ تربیت ان کی نس نس میں اترتی چلی جاتی ہے۔ بچوں کے ساتھ اس سے بڑھ کر بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہے کہ انھیں ایسی باتوں کی نصیحت کی جائے جس پر والدین خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس طرح نہ صرف بچوں پر ان کے نصائح کا اثر نہیں ہوتا بلکہ ان کے اخلاق میں نفاق کا بیج بھی پیوست ہو جاتا ہے۔ وہ برائی کے شعور سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں اور عمر بھر اپنے قول کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک عہد میں صحابیاتؓ کا طریقہ بھی یہی تھا کہ وہ بچوں میں اپنے عمل سے دین کی تعلیم اتارتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو حضورؐ کی خدمت میں لاتیں، ان کے لیے دعائیں کرواتیں، ان کے اچھے اچھے نام رکھتیں، ان کو دین کی تعلیم دیتیں، ان کے اندر جذبہ جہاد و شہادت پیدا کرتیں۔ خود حضورؐ کی مجالس میں جا کر دین کی تعلیم حاصل کرتیں۔ سوالات کے ذریعے اپنی ذہنی مشکلات کو حل کرتیں، اپنے اجتماعات کے لیے حضورؐ سے خصوصی وقت طلب کرتیں اور دین سیکھنے کے لیے پوری

سرگرمی اور تن دہی دکھاتیں۔ آج ہمارے پاس عائلی اور معاشرتی زندگی کا ایک منضبط' جامع اور بہترین نظام موجود ہے۔ اس کی ترتیب میں ان محترم خواتین کا بھرپور حصہ ہے جنھوں نے عائلی زندگی کے بارے میں مختلف سوالات پوچھ پوچھ کر اور حضورؐ سے احکام حاصل کر کے دین کے اس پہلو کی تشکیل و تدوین اور تشریح میں اپنا بہترین حصہ ادا کیا۔

خواتین پر یہ ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے کہ وہ گھر میں سکون و چین کی فضا مہیا کریں۔ جو مرد جہاد پر گئے ہوں ان کا کام بہت پر مصائب و پر صعوبت ہوتا ہے۔ ان کی بیویوں پر ان کے لیے گھریلو سکون و راحت مہیا کرنا' ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح زندگی کی معاشی دوڑ اور دیگر فرائض منصبی میں مصروف مردوں کی' جو اقامت دین کا کام بھی کر رہے ہوں' مصائب و مشکلات بے حد و حساب ہوتی ہیں' انھیں جسمانی و ذہنی صحت و تندرستی کی بحالی کے لیے گھروں کے پر سکون و پرامن ماحول کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس ماحول کے مہیا کرنے کی ذمہ داری عورتوں پر ہے جس میں مرد کو بھی اپنا حصہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا' بطریق احسن نمٹنا بڑا کار ثواب ہے۔ امن و سکون کی یہ فضا اور ماحول دین دار اور خدا خوفی رکھنے والی خواتین ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ دین دار مردوں کی دینی جدوجہد ہی دراصل خواتین کو امداد و نصرت کا وہ موقع فراہم کرتی ہے جس کے نتیجے میں وہ آخرت میں رضائے الٰہی پا کر کامیاب و کامران ہو سکتی ہیں۔ یہی تو وہ چیز ہے کہ جب خواتین نے آں حضورؐ سے پوچھا تھا کہ "یارسولؐ اللہ! مرد تو اللہ کی راہ میں جہاد کر کے بڑے بڑے درجات آخرت پا لیتے ہیں اور ہم گھروں میں ان کے بچے پالتی ہیں اور جہاد اور شہادت جیسی بڑی نیکی سے محروم رہ جاتی ہیں تو حضورؐ نے انھیں اطمینان دلایا تھا کہ تمھارا جہاد تمھارے گھروں میں ہے"۔

گھر ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ بچوں کی پرورش و تربیت' ان میں شعائر اسلامی کا احترام پیدا کرنا' اسلامی خطوط پر ان کی اٹھان' جہاد زندگانی میں مردوں کی سچی رفیق ثابت ہونا' ان کے دکھ درد کی ساتھی بننا' ان میں حوصلہ اور ہمت پیدا کیے رکھنا' ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ بٹانا اور گھر میں آمد و خرچ کے بارے میں صحیح رویے اختیار کرنا' ایسے کام ہیں جنھیں خواتین بطریق احسن انجام دیں تو وہ آخرت میں بہترین صلہ پالیں گی۔

آج کے مادہ پرستی کے زمانے میں حلال رزق پر قناعت کر کے توکل اور سادگی کی زندگی گزارنا ایک کڑے امتحان سے کم نہیں۔ لیکن دین دار' خدا خوف اور دانش مند خواتین' اس کڑے امتحان سے یوں کامیابی سے گزر جاتی ہیں کہ وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے کی فکر نہیں کرتیں۔ دنیا داری میں اپنے سے اونچے لوگوں کو نہیں دیکھتیں' کھوکھلی عزت اور جھوٹی نمود و نمائش پر نہیں ریجھتیں۔ وہ اپنے شوہروں کی حلال کمائی میں اپنی ضروریات کو محدود رکھتے ہوئے سادگی اور قناعت پسندی سے گزارا کرتے ہوئے خوش اور

مطمئن رہتی ہیں۔ ان کی یہ صفات ان کے مردوں کی ہمتیں بلند اور قدم تیز رکھتی ہیں۔ یہ بھی عورتوں کا ایک عظیم جہاد ہے۔ جن گھروں میں عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ دین دار ہوتی ہیں وہاں وہ اپنی دین داری، نیکی اور تقویٰ کا اثر اپنے حسن کردار، حکمت اور طرز عمل سے گھر کے مردوں پر بھی ڈال سکتی ہیں۔ قدرت نے عورت کو مردوں پر اثرانداز ہونے کی زبردست قوت عطا فرمائی ہے۔ اس قوت کو اگر وہ بروے کار لائیں اور بگاڑ کے بہتے دھارے میں خود بھی نہ بہنے لگیں بلکہ اپنی قوت نفوذ سے مردوں کو بھی بگاڑ اور خرابی کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کریں تو جتنی آسانی سے وہ یہ کام کر سکتی ہیں شاید باہر سے کسی اصلاحی تحریک کا کارکن نہیں کر سکتا۔ بڑے سے بڑا بگڑا ہوا مرد بھی اپنے گھر کے اندر فتنہ و بگاڑ پسند نہیں کرتا بلکہ حسن عمل اور امن و سکون کی فضا پسند کرتا ہے۔ اسی جذبے سے فائدہ اٹھا کر گھر کی خواتین اپنے گھروں کی فضا کو دین داری، خدا خوفی، نیکی اور بھلائی کے اثرات سے بھر سکتی ہیں۔ اس فضا سے اپنے مردوں کو متاثر کر کے وہ انھیں اصلاح کے کاموں میں لگا سکتی ہیں۔ پھر اس سے مزید آگے عزیزوں، رشتے داروں، ہمسایوں اور محلے داروں کا قریب ترین دائرہ ہے جس میں وہ اپنے اثرات کو پھیلا سکتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عورتوں میں دین داری کے جذبات کے باوجود ناخواندگی اور جہالت عام ہے۔ ان میں اشاعت و اقامت دین کی بہترین صورت یہ ہے کہ اپنے محلے میں کسی مقررہ مقام پر ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ باقاعدگی سے درس قرآن و حدیث کی محفل برپا کی جائے۔ اس محفل میں رشتے کی، میل جول کی، محلے کی تمام خواتین جمع ہوں اور دینی امور و علوم سے ہر طرح سے واقف اصلاح پسند خواتین انھیں قرآن و حدیث کا سبق دیا کریں۔ ان اجتماعات سے نیک کام کے لیے جمع ہونے اور سوچنے کی عادت پڑتی ہے۔ نیز دین کا فہم پیدا ہوتا ہے جس میں مسلسل اور پیہم وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ کسی تفسیر کی مدد سے چند آیات قرآنی کا ترجمہ و تشریح اور چند احادیث کا ترجمہ ہر بار اجتماع میں شرکت کرنے والی خواتین کو دین کی بہت سی باتیں ذہن نشین کرا دیتا ہے جس سے ان کے طرز عمل اور روز مرہ زندگی پر محسوس اثرات نمودار ہوتے ہیں۔ انھیں اصلاح اخلاق اور تبلیغ دین کے مختلف طریقے سیکھنے، سمجھنے اور استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے ان کی دینی حس توانا رہتی ہے، دینی شعور بیدار رہتا ہے اور دین کی مدافعت اور خدمت کا جذبہ ہر دم تازہ اور مستعد رہتا ہے۔

ایسے اجتماعات کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کی مدد سے دائرۂ اصلاح کو ہمہ پہلو پھیلایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر صاحب علم، دینی شعور سے بہرہ ور اور دور جدید کے تقاضوں سے آگاہ خواتین سے یہ کام لیا جائے تو اس کے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ خواتین، خواتین کے مسائل پر تقاریر کر سکتی ہیں، رسائل و اخبارات میں لکھ سکتی ہیں اور خواتین میں پیدا شدہ خرابیوں کے خلاف قلمی جہاد کر سکتی ہیں۔ دیگر خواتین

سے ملاقاتیں کر کے انھیں اس کام پر مائل کرنے کے لیے بھی ان اجتماعات میں پروگرام بنائے جا سکتے ہیں۔

ان اجتماعات کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان میں اولاد کے مسائل بھی زیر غور آتے ہیں۔ اس اجتماعی ماحول میں ان کے مسائل پر غور و فکر کرنے اور اصلاح احوال کی تدابیر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک دوسرے کے عملی تجربات اور نتائج سے فائدہ اٹھانے کی تربیت ہوتی ہے۔ اس طرح خواتین اندرون خانہ تربیت اطفال کے نت نئے تجربات کر کے اور نئی نئی تدابیر اختیار کر کے بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔

آج کا دور' شاید ہمیشہ کی طرح' آلام و مسائل کا دور ہے۔ آج کا انسان ہر قسم کی پریشانیوں میں مبتلا اور درماندگی کا شکار ہے۔ ایسے اجتماعات میں اسے دوسرے ہمدرد انسانوں کے مشورے مل جاتے ہیں جس سے اس کی ہمت بندھتی ہے۔ اپنے دکھ سکھ کے بیان اور اظہار سے ان کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے اجتماعات کی مدد سے بہت سے شریف اور دین دار گھرانوں سے روابط کے مواقع پیدا ہوتے ہیں جو بہت سی معاشرتی تسلیوں اور سہولتوں کا باعث بن جاتے ہیں۔

ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں البتہ ان میں پیدا ہونے والے بعض فتنوں اور خرابیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جن کے سدباب کے لیے اگر فوری اور عملی اقدامات نہ کیے جائیں تو نقصان اٹھانے' غلط فہمیاں پیدا ہونے اور دلوں میں دوریاں پیدا ہونے کے خطرات بھی موجود ہوتے ہیں۔ ایسے فتنوں اور خرابیوں سے آگاہی اور ان سے بچاؤ کی تدابیر کا اہتمام کرنا نہایت ضروری ہے۔

خواتین کے اجتماعات کا سب سے بڑا فتنہ حسد' غیبت اور چغلی ہے جن کی بدولت دین داری اور خدا ترسی کی ساری فضا مسموم ہو کر رہ جاتی ہے اور دلوں میں دوریاں اور رنجشیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہوشمند خواتین کا کام ہے کہ اپنے اجتماعی ماحول میں ان افعال قبیح کی بیخ کنی کا اہتمام کریں۔ غیبت اور چغلی' حسد و رشک خواتین کی انفرادی گھریلو زندگی کے لیے بھی بڑی خرابی کی چیزیں ثابت ہوتی ہیں۔ ان سے اگر چھٹکارا پا لیا جائے تو ان کی اجتماعی زندگی ہی نہیں گھریلو زندگی بھی خوشگوار اور پاکیزہ بن جائے گی۔ ہربات' ہر حرکت پر بے جا تنقید اور حرف گیری بھی فتنہ و فساد کے حکم میں داخل ہے۔ اس سے ایک دوسرے سے بغض و عناد کو راہ ملتی ہے۔ اس سے دائرۂ اصلاح سکڑ جاتا ہے۔ اس لیے خواتین پر لازم ہے کہ اپنی ان عادات کو سختی سے دبائیں اور اپنی اخلاقی اصلاح کریں۔ عزت نفس اور پندار کا شیطانی مسئلہ بھی ہرگز نہ کھڑا ہونے دیں۔ ایسا طرز عمل تو ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ آپ تو اصلاح نہ کر سکیں البتہ دوسروں کے شیطان کو بھڑکا کر دائرہ اصلاح سے دور لے جانے کا باعث بن جائیں۔

اس قسم کے اجتماعات میں امیر غریب کے امتیازی سلوک سے پرہیز بھی لازم ہے۔ یہاں ہر قسم کے گھرانوں کی خواتین جمع ہوتی ہیں۔ ان میں غریب گھرانوں کی خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ حکمت دین کا

تقاضا یہ ہے کہ خواتین میں امارت و غربت کا کوئی احساس پیدا نہ ہونے دیا جائے، نہ نشست و برخاست میں نہ بات چیت میں، نہ طرز عمل اور رویے میں، نہ مہمان داری اور باہمی تعلقات میں۔ مساوی طرز عمل اور یکساں حالات کا اہتمام کرنا، ان خواتین کا بہت بڑا فریضہ ہے جو ایسے اجتماعات کے اہتمام میں پیش پیش ہوں۔

اسلام نے عورت کو گھر کی چار دیواری ہی میں محدود نہیں رکھا۔ اسے ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے کی اجازت دی ہے اور معاشرتی امور میں حسب ضرورت عملاً حصہ لینے کی اجازت بھی دی ہے۔ ان امور میں تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، درس و تدریس جیسے امور خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ سماجی سرگرمیوں میں بھی عورتیں اپنا حصہ اور مقام رکھتی ہیں۔

ہمارے ملک میں خواتین کی ایک تعداد ملازمت پیشہ بھی ہے۔ ان کی ملازمتیں مستقل بھی ہیں اور عارضی بھی، کل وقتی بھی ہیں اور جزوقتی بھی۔ تعلیمی و تدریسی، تجارتی و زراعتی، صنعتی و انتظامی غرض ہر میدان میں خواتین دخیل کار ہیں۔ ان کے طریق کار بھی مختلف ہیں اور مسائل بھی۔ اپنے مسائل اور الجھنوں کے حل کے لیے ان خواتین کا اپنی جائے ملازمت میں ایک بزم یا انجمن بنالینا نہایت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ بزم ماہ بہ ماہ ایک مشاورتی اجلاس منعقد کیا کرے جس میں متعلقہ ادارے کی خواتین کے مسائل کے حل کی تدبیریں سوچی جائیں اور ان کی الجھنوں اور مشکلات کو رفع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس طرح کی انجمن متعلقہ ادارے کی کارکن خواتین میں باقاعدہ نظم و ضبط پیدا کر کے انھیں ایک مکمل خاندان کی صورت میں متحد و مربوط کر سکتی ہے۔ اس طرح ان خواتین میں نہ صرف ایک دوسرے کے لیے محبت و خیر خواہی اور ایک دوسرے کے دکھ درد سمیٹنے اور کام آنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بلکہ یہ اس ادارے میں دور رس اصلاحات کے نفاذ اور اس کی کارکردگی میں بہتری کا باعث بھی ہوتا ہے۔

خواتین کی جائے ملازمت بھی دعوت دین کا ایک میدان ہے۔ وہ جن اداروں سے منسلک ہوں وہاں ان کے لیے اوقات نماز میں نماز پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ایک دارالمطالعہ ہونا چاہیے جس میں قرآن حکیم، حدیث، تفسیر اور دیگر مذہبی امور سے متعلق کتب مہیا کی جائیں۔ کارکن خواتین میں نماز کی پابندی اور ان کتب کے مطالعے کا شوق پیدا کیا جائے۔ اس سلسلے میں ان اداروں میں دعوت دین کے لیے ہفتے کے ہفتے دینی اجتماع منعقد کروائے جائیں۔ جن میں دینی شعور رکھنے والی تعلیم یافتہ خواتین متعلقہ ادارے کی تمام کارکن خواتین کو قرآن و حدیث و فقہ کی تعلیم دینے کے فرائض انجام دیا کریں۔ ہر ادارے میں پردے کا اہتمام کرتے ہوئے علمائے دین کے لیکچروں کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔ آج کل آڈیو کیسٹوں کے ذریعے دعوت دین کا کام بڑے موثر اور وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس کا استعمال بھی بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طریقے سے ناخواندہ، نیم خواندہ اور نابینا کارکنوں کو بھی تعلیم دی جا سکتی ہے اور ان کے دل و دماغ

تک دعوت دین پہنچائی جا سکتی ہے۔ ان اداروں سے ایسے رسائل کا اجرا بھی کیا جا سکتا ہے جن میں لوازمے کے مسائل کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث و فقہ سے متعلق ضروری مضامین کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہو جو خواتین کے لیے ہر جہت راہنمائی کے فرائض بطریق احسن پورا کر سکیں۔

حاصل کلام یہ کہ اصلاح معاشرہ کے کام میں باشعور اور دینی تعلیم و تربیت سے بہرہ مند خواتین بہت عمدگی سے اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ معاشرے میں نمودار ہونے والے بعض منفی رجحانات تو ایسے ہوتے ہیں جن کی خواتین اول قدم پر ہی اپنی انفرادی کوششوں سے اندرون خانہ بیخ کنی کر سکتی ہیں۔ شوہروں کے لیے جسمانی و روحانی سکون و تسکین' اپنے قول و عمل سے اولادوں کو دین داری کا درس اولین' گھروں میں توکل و قناعت اور سکون و آرام کی فضا کی فراہمی' سب فرائض سے وہ کماحقہ نمٹ سکتی ہیں۔ کم آمدنیوں کو اپنے سلیقے اور محنت سے استعمال کر کے عزت و آبرو اور خود داری سے رہنے کا سامان پیدا کر سکتی ہیں۔ اپنے تعاون' رفاقت اور ہمت افزائی سے مردوں کو دینی اور دنیوی ترقی کے دروازے پر پہنچا سکتی ہیں۔ اپنے ہمسایوں اور عزیزوں کے سامنے اپنے کردار و اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کر کے کتنے ہی گھروں میں اصلاح احوال کی بنیاد رکھ سکتی ہیں۔ دینی اجتماعات کی بدولت کتنے ہی دلوں میں اپنے اخلاق کی عمدگی' شائستگی' ادب و تواضع' احترام و حسن خلق سے دین داری کا شوق پیدا کر سکتی ہیں۔ ہمسایوں کے حقوق کی پاس داری کرتے ہوئے اپنے نیک سلوک سے اپنے آس پاس ایک ہمدرد' مہذب' دین دار اور معاون ماحول پیدا کر سکتی ہیں اور دین کے لیے ایثار و قربانی کا عملی مظاہرہ کر کے ان مجاہدات میں شامل ہو سکتی ہیں جن کے لیے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھروں کو ہی میدان جہاد قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی ہی وہ مائیں ہوتی ہیں جن کی رضامندی اور خدمت کو باپوں کے مقابلے میں بھی تین بار فضیلت اور فوقیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ ایسی ماؤں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ ایک مسلمان خاتون کے لیے یہ ایک قابل فخر مقام ہے جو اس کے دین نے اسے دیا ہے' لیکن ظاہر ہے بلند مقامات کے حصول کے لیے پیہم جدوجہد' مسلسل محنت' ایثار و قربانی اور نفس کشی وہ شرائط ہیں جنھیں کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اخبار امت

کوسووو کے مقتل میں شاطروں کی بازی گری

محمد ایوب منیر

کوسووو کی آبادی کا پانچواں حصہ اپنے گھربار، کھیت، کاروبار چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں اور غیر آباد مقامات کا رخ کر چکا ہے۔ کم از کم چار لاکھ البانوی النسل مسلمان گھروں سے بھگائے جا چکے ہیں اور بیس ہزار سے زائد گھر، سرب فوجی اور نیم فوجی دستے لوٹ چکے ہیں، دارالحکومت پرسٹینا کے ارد گرد چار صد سے زائد دیہات تباہی و بربادی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ خوراک، ادویات، بستر اور چھت سے محروم بہت بڑی تعداد ٹی بی، زرد بخار اور دیگر امراض کا شکار ہو رہی ہے۔ دوسری طرف امت مسلمہ کے ممالک، عوام اور حکمران اپنے اپنے مسائل میں غرق ہیں۔ قلب یورپ میں ان کے بھائیوں اور بہنوں پر کیا گزر رہی ہے، اس کا احساس کرنے کی انھیں فرصت نہیں ہے۔

۹ ماہ ہونے کو آرہے ہیں، ایک گھری ہوئی مسلم آبادی پر، ایک ملک کی باقاعدہ فوج اور فوجی دستے، ہر قسم کے انسانی احساس سے عاری ہو کر، ظلم کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں۔ بوسنیا میں مظلوم مسلمانوں پر جو کچھ گزرا، وہ تہذیب کے علم بردار یورپ کو شرم دلانے کے لیے کافی نہ تھا کہ ٹھیک اندازوں کے مطابق، اور منصوبے کے تحت کوسووو کی مسلم آبادی کو نشانہ بنایا گیا۔ روس کی کھلی، اور امریکہ اور دوسرے ممالک کی درپردہ آشیرباد کے ساتھ، صدی کا سفاک ترین، اسٹالن کو بھی شرما دینے والا، سربیا کا صدر اپنے منصوبوں پر بلاخوف و خطر عمل پیرا ہے۔ درپردہ بھی کیا، سارا کھیل سامنے ہے، کوئی خود کو دھوکا دینا چاہے تو دے۔ لیکن المیہ تو یہ ہے کہ مسلم ممالک اور ان کے حکمران اپنے بھائیوں اور بہنوں کو قصابوں کے حوالے کر کے بے فکر ہیں کہ یہ تو یورپی مسئلہ ہے۔

کوسووو کے مقتل میں سفارت کاروں، سماجی تنظیموں اور خبر رساں ایجنسیوں کا داخلہ بند ہے۔ لیکن مغربی دنیا کے ہی بعض رپورٹر جان کی پروا نہ کر کے پہنچے اور خبریں لائے (مسلم ممالک کی ایجنسیوں اور اخباروں کی دلچسپی کے لیے اور بہت کچھ ہے!)۔ ہفت روزہ نیوز ویک کے مطابق: "نیوز ویک نے سفارت

کاروں' انسانی حقوق کے بارے میں تفتیش کرنے والوں' زندہ بچ جانے والوں اور چشم دید گواہوں سے معلومات حاصل کر کے گذشتہ فروری میں سرب حملے کے بعد سے قتل عام کے ۱۲ مقامات کی ایک مصدقہ فہرست ــــ جو یقیناً جزوی فہرست ہے ــــ مرتب کی ہے۔ قتل و غارت کے بدترین تین واقعات ۲۳ سے ۲۶ ستمبر کے درمیان ہوئے اور جب ان کی روح فرسا تفصیلات عام ہوئیں تو امریکہ اور اس کے حلیفوں نے سوچا کہ اب قتل رکنا چاہیں۔ (۱۲ اکتوبر ۹۸)

نیوز ویک نے کچھ تفصیلات دی ہیں۔ ۸ ماہ کے شیر خوار کے سر میں گولی مار دی گئی۔ حاملہ عورت کو ہلاک کر دیا گیا اور درخت سے باندھ کر آگ لگا دی۔ ایک بازار میں ایک گاڑی میں بیٹھے مسلح سرب ڈرائیور نے رستہ چلتے ۳ نوجوانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ زندہ انسانوں کی آنکھیں نکالنا ان کا پسندیدہ شغل ہے۔ نائب وزیر اعظم نے ٹی وی پر کہا کہ آنکھیں نکالنے کے لیے زنگ آلود دو شاخہ کانٹا (fork) استعمال کرو۔ (پھر بھی یورپ مہذب ہے!)۔

کوسوو مرکز اطلاعات کے مطابق ۳۰ اگست کو سرب فوج نے ۲۷ البانوی دیہاتوں کے خلاف بڑا آپریشن کیا اور کئی روز کی بمباری' اسلحہ کے استعمال اور خانہ تلاشی کے بعد ۳۲ ہزار باشندوں کو سرحد کے قریب جنگلوں کی طرف دھکیل دیا۔ ان میں سے نصف دیہات کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ ایک بلدیہ اور ایک علاقے کی کہانی نہیں (لیکن ہمارے اخبارات میں کتنوں کا ذکر آیا ہے؟)۔

ہفت روزہ ٹائم کا نمایندہ ڈگلس والر رقم طراز ہے: "دارالحکومت پرسٹینا کے اردگرد کی آبادی سربوں کا اولین نشانہ ہے۔ سرب فوج بغاوت کچلنے کے بہانے بے بس اور نہتے دیہاتیوں کو تہ تیغ کر رہی ہے۔ جس دیہات میں کارروائی ہوتی ہے وہاں سب سے پہلے گولیاں برسائی جاتی ہیں تاکہ کوسوو لبریشن آرمی کی موجودگی کا جائزہ لیا جائے۔ اس کے بعد مسلح دستے گاؤں میں گھس کر تشدد کرتے ہیں۔ پھر پیادہ فوجیوں کا کام شروع ہوتا ہے۔ وہ گھروں کو لوٹتے جاتے ہیں اور رہزنی کے بعد مکانوں کو آگ بھی لگا دیتے ہیں۔ اس سے اردگرد کے دیہاتوں میں دہشت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ قتل اور زخمی کرنے کے واقعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ شدید ترین برف باری کے باوجود ہزاروں لوگ اپنا گھر بار چھوڑ چکے ہیں۔ (۵ اکتوبر ۹۸)

جو سماجی تنظیمیں وسیع جنگلات میں پھیلے ان مسلمانوں کو خوراک فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں' ان کا سامان لوٹ لیا جاتا ہے اور خوراک و ادویات بھی ضبط کر لی جاتی ہیں۔ واشنگٹن اوپن سوسائٹی انسٹی ٹیوٹ کے جان فاکس کا کہنا ہے کہ اگر ادویات ان باشندوں تک نہ پہنچائی گئیں تو ان جنگلات میں سے بچوں کی لاشیں اسی طرح ملیں گی جس طرح خشک لکڑیاں پہاڑوں اور جنگلات میں ملتی ہیں۔ (روزنامہ ڈان' ۲۸ ستمبر ۹۸)

ظالم سلوبودان میلاسووچ کی پالیسی یہ ہے کہ بوسنیا کے برخلاف کوسووو میں کہیں بھی اجتماعی قبروں کا نشان نہ ملے اور تین ماہ بعد وہ عالمی ذرائع کے سامنے اعلان کر سکے کہ بغاوت دبا دی گئی ہے' مداخلت کار فرار ہو چکے ہیں' صوبے کو وسیع تر آزادی دی جا رہی ہے۔ منفی زیرو سے نیچے کے درجہ حرارت میں سرب فوج کا اسلحہ بھی ضائع نہ ہو گا۔ کیونکہ دور دراز کے جنگلات اور بیابان میں نہ خوراک میسا ہے نہ ادویات نہ سامان زندگی' بہت بڑی تعداد اگلے چند ماہ میں سردی سے ہی مر جائے گی۔

سولہ ممالک پر مشتمل شمالی اوقیانوس معاہدہ تنظیم' ناٹو' طاقت ور دفاعی تنظیم ہے۔ فرانس' برطانیہ' امریکہ اور جرمنی اس کے سرکردہ ارکان ہیں۔ اس کی افواج یورپ کے کئی علاقوں میں متعین ہیں۔ چھ ممالک پر مشتمل رابطہ گروپ کوسووو کے بحران کو حل کرنے میں مصروف ہے۔ لیکن سب ہی چاہتے ہیں کہ سربیا کی فوج کے ذریعے کوسووو لبریشن آرمی کا صفایا ہو جائے۔ جون میں فضائی حملوں کی دھمکی دی گئی تھی کہ گیارہ فضائی اڈوں سے ناٹو کے طیارے سربیا کی فوج پر حملے کریں گے۔ چار ماہ گزر گئے' مہلت میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے' اور ناٹو کے افسران غیر سنجیدہ اجلاسوں کے ذریعے البانوی مسلمانوں کے قتل عام کا نظارہ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ناٹو کا کوسووو رابطہ گروپ بھی میلاسووچ کے ساتھ شریک جرم ہے۔ اسی لیے روسی اسلحہ بڑی تعداد میں سربوں کو میسا کیا جاتا ہے۔ روس' سلامتی کونسل میں سربیا کے خلاف فضائی حملوں کی قرارداد ویٹو کرنے کا اعلان کر چکا ہے۔

یورپی ممالک کا کمیشن بھی پیچھے نہیں ہے۔ دیگر یورپی ممالک سے جو البانوی النسل باشندے امدادی رقوم' ابراہیم رگووا کی حکومت یا کوسووو لبریشن آرمی کو بھیجتے تھے' اس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے تاکہ ظالم اپنی مرضی سے قتل عام کرتا رہے اور مظلوم کو کہیں سے مدد بھی نہ ملے۔

سابق امریکی صدارتی امیدوار اور سابق سینیٹر باب ڈول نے ستمبر کے مہینے میں کوسووو کا دورہ کیا۔ اس نے سلوبودان میلاسووچ سے ملاقات کی اور بتایا کہ صدر سربیا کو اپنے جاہ کن اقدامات پر کسی کا خوف لاحق نہیں ہے۔ اس نے لکھا ہے: "سربوں کے حملوں کا اولین نشانہ نہتے بے بس شہری ہیں۔ ریلیف کا کام کرنے والے اداروں اور افراد کو مطلوبہ جگہوں پر پہنچنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ انھیں ہراساں کیا جاتا ہے"۔

اس صورت حال کو سمجھنا بالکل آسان ہے کہ امریکی یہی چاہتے ہیں کہ اہل کوسووو آزادی کا خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور سربوں کی غلامی (وسیع تر صوبائی خود مختاری) قبول کر لیں۔ اسی وجہ سے ایک بین الاقوامی تجزیہ نگار تھامس لپ مین یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے کہ کوسووو کی موجودہ حالت امریکی صدر کی صنفی مقدمات میں طلبی کی وجہ سے نہیں بلکہ سرب حکومت اور واشنگٹن کی باہمی رضامندی کی بدولت ہوئی ہے۔ سرب' کوسووو کی تحریک آزادی کو کچلنا چاہتے ہیں اور صدر امریکہ کو بھی بلقان کے اندر ایک اور مسلم ریاست دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

کوسووو کا بحران کس طرح حل کیا جائے؟ ضروری ہے کوسوود کی آزادی کو محفوظ اور برقرار رکھنے کے لیے بھرپور اور مسلسل فوجی کارروائی ہو۔ مائیلوسیوچ اور اس کے رفقا' طاقت کی زبان کو سمجھتے ہیں۔ بوسنیا کے اندر دو لاکھ انسانوں کا خون بہانے کے باوجود وہ برسراقتدار اسی لیے ہے کہ اسے مغربی ممالک کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ناٹو کے طیارے اور میزائل بلغراد کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ نہتے باشندوں کا قتل عام بلکہ نسل کشی بند کرے۔ یورپ کا مفاد بھی اسی میں ہے۔ اقتصادی بحران کے دہانے پر کھڑے اہل یورپ کو اپنے آپ کو ایک جنگ کے اندر نہیں جھونکنا چاہیے۔

امت مسلمہ کے سربراہوں' فوجی طاقتوں کے حامل مسلم ممالک اور تازہ تازہ ایٹمی دھماکے کرنے والے پاکستان کے کردار کا کیا تذکرہ کیا جائے۔ اگر یہ سب مل کر کوئی موقف اختیار کریں تو صورت حال پر واضح اثر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن جو کشمیر اور فلسطین پر سودے کر رہے ہیں' وہ کوسووو میں کوئی کردار کیوں ادا کریں۔ لیکن امت کے بیدار عناصر کو اپنا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے اپنے ملکوں میں بھی حکومتوں پر دباؤ ڈالیں اور منظم ہو کر' بین الاقوامی اداروں کو بھی اقدام پر آمادہ کریں۔

ان حالات میں کوسووو لبریشن آرمی کے مجاہدین پر آفرین ہے۔ مغربی اخبارات کے جو نمایندے ان سے مل کر آتے ہیں' ان کے حوصلے اور عزم کی داستان سناتے ہیں۔ وہ مکمل آزادی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں۔ اور مزید قربانیوں کے لیے تیار ہیں۔

ملائیشیا کی صورت حال

اظہر اقبال

نائب وزیر اعظم انور ابراہیم کی برطرفی' گرفتاری' الزامات' مقدمات اور اس پر عوامی ردعمل نے ملائیشیا کو عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ ملائیشیا جنوب مشرقی ایشیا کی مسلم اکثریتی ریاست ہے جسے تاریخی طور پر ملایا کہا جاتا رہا ہے۔ یہ اپنی سیاسی آزادی کے لحاظ سے عمر میں پاکستان سے دس سال چھوٹی ہے اور آبادی کے لحاظ سے کراچی سے کچھ زیادہ تقریباً ۱۸ ملین (ایک کروڑ اسی لاکھ) اور رقبے کے لحاظ سے مشرقی ملائیشیا (صباح اور سراوک) کو ملا کر یہ مشکل ۳ لاکھ ۳۳ ہزار مربع کلو میٹر ہے جس میں دو لاکھ مربع کلو میٹر صباح اور سراوک کا علاقہ ہے۔ گویا اصل جزیرہ ایک لاکھ ۳۳ ہزار مربع کلو میٹر ہے۔ رقبے کی کمی' آبادی کی قلت اور مختصر سیاسی آزادی کے باوجود جنوب مشرقی ایشیا ہی نہیں پورے عالم اسلام میں معاشی ترقی کی تیز رفتاری اور جمہوری روایات کے حوالے سے اسے ایک ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ ملائیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد نے مغرب پر اپنی بے باک تنقید کی بنا پر عالم اسلام میں ایک باوقار قائد کا مقام حاصل کیا اور ملائیشیا کو بطور ایک معاشی ماڈل کے پیش کیا جانے لگا۔

ڈاکٹر مہاتیر نے گذشتہ ایک عشرے میں ملائی (malay) ترقی کے بہت سے منصوبوں میں ملائی افراد کو بعض حقوق دے کر جہاں مسلم آبادی میں مقام احترام حاصل کیا وہیں اپنی اتحادی جماعتوں باریسان نیشنل، ہندی نژاد ملیشین انڈین کانگریس اور چینی نژاد سیاسی جماعتوں کے اتحاد سے "اومنو" (UMNO) یعنی متحدہ ملیشیا قومی تنظیم کو متحد کر کے اس کی قیادت کو سنبھالا اور اپنی محب وطن پالیسی کی بنا پر بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد ۱۹۸۱ میں پہلی دفعہ وزارت عظمیٰ اور حکمران پارٹی کی سربراہی پر فائز ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد انڈین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی سیاسی ضرورت تھی کہ ان کی ٹیم میں ملائی قوم (جو کہ کل آبادی کا ۵۵ فی صد اور ۱۰۰ فی صد مسلمان ہے) کا کوئی بااثر اور مقبول عام نوجوان راہنما شامل ہو۔ اس معیار پر کوئی پورا اترتا تھا تو وہ ملائیشیا کی تحریک اسلامی "آبیم" (ABIM) یعنی اتحاد الشباب الاسلامی کا سربراہ انور ابراہیم تھا جسے جلد یا بدیر عملی سیاست میں آنا تھا۔ مہاتیر کی نظر انتخاب انور ابراہیم پر پڑی اور وہ اسے "اومنو" میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

انور ابراہیم ۱۹۷۱ میں قائم ہونے والی مسلم یوتھ موومنٹ، "آبیم" کے بانی افراد میں شامل تھے اور پہلے سال ہی نائب سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اگلے دو سال سیکرٹری جنرل منتخب ہوتے رہے اور اپنی قائدانہ صلاحیت اور محنت کے بل بوتے پر ۱۹۷۴ میں "آبیم" کے صدر منتخب ہو گئے۔ یونی ورسٹی آف ملایا میں معاشیات کی تعلیم کے دوران طلبہ کے بہت سرگرم اور مقبول راہنما تھے۔ تعلیم کے اختتام کے بعد بھی نوجوانوں میں دعوت اسلام سرگرمیوں کے باعث کئی بار پس دیوار زنداں کیے گئے۔ مسلسل نو سال تک "آبیم" کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۸۳ میں انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی فطری سیاسی پارٹی "پاس" (PAS، اسلامی تحریک ملائیشیا) میں شامل ہونے اور اس کی متوقع قیادت پر فائز ہونے کی بجائے حکمران پارٹی "اومنو" میں شامل ہو گئے۔ "آبیم" کی قیادت نے ان کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے اور اپنے اس فلسفے کا اظہار کرتے رہے کہ وہ "اومنو" میں شمولیت کے نتیجے میں، جو قیام ملائیشیا (۱۹۵۷) سے لے کر اب تک مسلسل برسراقتدار چلی آرہی ہے، زیادہ بہتر طریقے پر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکیں گے۔

انور ابراہیم کو "اومنو" کے یوتھ گروپ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اس پر مہاتیر کو اپنی پارٹی کے اندرونی حلقوں کی مخالفت بھی برداشت کرنا پڑی اور انور ابراہیم کی کافی شرائط بھی چار و ناچار ماننا پڑیں۔ انور ابراہیم نے اپنی غیر معمولی قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد پارٹی میں مقبولیت حاصل کر لی اور ڈاکٹر مہاتیر کے انتخاب کو درست ثابت کر دیا۔

ڈاکٹر مہاتیر محمد مسلسل سترہ سال سے وزارت عظمیٰ اور پارٹی کی سربراہی پر فائز ہیں اور اب فطری طور پر اپنے متبادل کی فکر میں تھے اور قوم بھی "اومنو" پر اعتماد کے باوجود اب نئی لیڈر شپ کا تقاضا کر رہی تھی۔ تین

سال قبل یہ بات تقریباً طے تھی اور معلوم و معروف تھی کہ انور ابراہیم آیندہ وزیراعظم ہوں گے۔ گذشتہ دنوں مہاتیر دو ماہ کی چھٹی پر گئے تو تمام معاملات ان کے ہی حوالے کیے۔ مگر نسلی حکمرانوں کی اولاد اور دیگر مفاد پرستوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک انور کو راستے سے نہیں ہٹایا جاتا' ان میں سے کسی کو بھی آگے بڑھنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ لہٰذا سینیٹر زین الدین' ۶۱ سالہ ماہر معاشیات رزالی (Razaleigh' جو ۱۹۸۷ میں پارٹی صدارت کے الیکشن میں ڈاکٹر مہاتیر کا مخالف امیدوار تھا)' ۵۸ سالہ وزیر خارجہ عبداللہ بداوی' ۴۵ سالہ وزیر تعلیم نجیب تن رزاق (سابق وزیراعظم تن عبدالرزاق کا بیٹا)' عبدالرحیم چک (سابق چیف منسٹر آف ملاکا سٹیٹ) اور سہار الدین چک سیکرٹری جنرل "اومنو" سرگرم عمل ہو گئے۔ ایک طرف انھوں نے ڈاکٹر مہاتیر کے قریب ہونے کی کوشش کی اور اس کی تمام پالیسیوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف کرتے رہے مگر دوسری طرف انور ابراہیم اور ڈاکٹر مہاتیر کے درمیان بعض امور پر اختلاف رائے کو ہوا دے کر خلیج کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔

انور ابراہیم کا "اومنو" میں شامل ہونا خود وہاں کی تحریک اسلامی "آبیم" اور "پاس" کے لیے حیرت اور صدمے کا باعث بنا' لیکن دونوں تحریکات نے جلد اس حقیقت کو سمجھا کہ سیاسی تعلقات اور رابطوں میں بعض اوقات تحریکات اسلامی کے اکابر یا خود تحریکات کو مصالح کی بنا پر ایسے اتحاد کرنے پڑتے ہیں جو بظاہر حیران کن معلوم ہوتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں مہاتیر نے اپنی پارٹی کے مفاد میں انور ابراہیم کو اپنے ساتھ شامل کیا اور ۱۳ سال تک انور ابراہیم کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھاتے رہے۔ انور ابراہیم نائب وزیر مذہبی امور' وزیر برائے شباب' وزیر تعلیم اور وزیر مالیات رہنے کے بعد نائب وزیراعظم کے عہدے تک پہنچے اور خود "اومنو" کے ڈپٹی صدر بنے اور ڈاکٹر مہاتیر کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ ان کی غیر موجودگی میں قائم مقام وزیراعظم کی حیثیت سے دو ماہ سے زائد حکومت کی۔ ڈاکٹر مہاتیر نے اس اعتماد کا اظہار اپنے کسی نائب پر کبھی نہیں کیا تھا۔ پھر اچانک سیاسی نقشے میں تبدیلی کیوں؟ بعض اوقات غیر معمولی اہم واقعات کے پیچھے بہت معمولی سے اسباب بھی ہوتے ہیں لیکن ملایشیا کی اس انقلابی تبدیلی میں محرکات ملے جلے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ کہ انور ابراہیم گو "اومنو" کے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچے لیکن انھوں نے اپنی اسلام سے وابستگی اور تحریکات اسلامی سے اپنے تعلق کو کبھی کم نہ ہونے دیا اور اپنی ذاتی زندگی میں اسی سادگی کو برقرار رکھا جو تحریک اسلامی سے تربیت پانے والے کسی فرد میں ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی صلاحیت کی بنا پر ملایشیا ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی سوجھ بوجھ کو تسلیم کروایا۔ غالباً یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی بنا پر ایک سال قبل ایک موقع پر' جب اتفاق سے ڈاکٹر مہاتیر اور انور ساتھ ساتھ ایک بیرونی ملک کے دورے پر گئے تو ڈاکٹر مہاتیر کے مقابلے میں انور ابراہیم کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ جسے ڈاکٹر مہاتیر نے لازماً محسوس کیا۔ انور ابراہیم کے خطابات میں علمی اور فکری بالیدگی اور فکر میں تازگی کا اندازہ نہ

صرف اہل ملک بلکہ ہر ملنے والے کو ہوتا رہا۔ ڈاکٹر مہاتیر نے محسوس کیا کہ انور ابراہیم کی جاذب نظر شخصیت کے سامنے وہ اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں۔

ایک بالغ نظر سیاست دان کے لیے ایسے مواقع فیصلہ کن ہوتے ہیں اور قومی مفاد میں ایسے فیصلے بھی کرنے ہوتے ہیں جو ذاتی طور پر ناگوار ہوں۔ لیکن مہاتیر نے نوشتہ دیوار کو پڑھنے سے انکار کیا اور ایک ایسے فرد کو جسے خود انھوں نے ہر ممکنہ موقع اور امتحان سے گزار کر وزارت عظمیٰ کے عہدے کے لیے تیار کیا تھا' ایسے انداز میں ہٹایا جو ملایشیا میں ہی نہیں' ہر باوقار ملک اور فرد کے لیے افسوس ناک بلکہ شرم ناک کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مہاتیر نے انور ابراہیم پر جو الزامات لگائے ہیں وہ اتنے بے معنی' بے بنیاد اور اس حد تک گرے ہوئے ہیں کہ ان کا نقل کرنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ایک ضمنی بات جو اس حوالے سے کہی گئی ہے جو کہ ایک طرح سے مغرب کی طرف سے انور ابراہیم کی حمایت ہے' یعنی انور مغرب کے پروردہ ہیں' جبکہ ڈاکٹر مہاتیر خود مشرقی فکر کے نمایندہ۔ انور ابراہیم کو جاننے والے جانتے ہیں کہ ان سے زیادہ مغرب کو ناپسند کرنے والا شخص غالباً "اومنو" میں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس قضیے میں اول الذکر سبب کے علاوہ جو محرکات نظر آتے ہیں۔ وہ تین ہیں' اول: انور ابراہیم کی تحریکی جڑوں کی بنا پر "اومنو" کے سیکولر عنصر کی ناپسندیدگی۔ دوم: انور ابراہیم کی "اومنو" کے مفاد پرست اور معاشی بدعنوانیوں میں ملوث افراد کی گرفت جس میں خود ڈاکٹر مہاتیر بھی شامل ہیں' جن کے بڑے صاحبزادے ۲۸ قومی اور بین الاقوامی معاشی منصوبوں اور کمپنیوں کے صدر ہیں اور جس کا اظہار انور نے بالواسطہ طور پر کیا۔ سوم: انور ابراہیم کی معاشی حکمت عملی جس میں انھوں نے ڈاکٹر مہاتیر کے منظور نظر افراد کے بھاری قرضوں کو معاف کرنے سے صاف انکار کابینہ کے اجلاس میں کیا اور اس طرح وہ اختلاف جو ایک سال سے ٹھنڈے انداز میں چل رہا تھا اچانک گرم ہو گیا۔

آج ملایشیا میں جو سیاسی انتشار پیدا ہوا ہے وہ کس رخ پر جائے گا اور مستقبل قریب میں کیا امکانات ہیں' اس پر یقین سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن جو بات صاف طور پر نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ انور ابراہیم کے حق میں عوامی تحریک بہت جلد ڈاکٹر مہاتیر کے زوال کا سبب بنے گی (رسالہ Fortune نے ۲۶ اکتوبر کی اشاعت میں مہاتیر کو "Next Suharto" لکھا ہے) اور ریفارماسی (Reformasi) کا نعرہ ملک میں بڑی تبدیلی کا باعث بنے گا۔ "پاس" اور "آبیم" ایک دوسرے کے مزید قریب آئیں گی اور اسلامی تحریک کی سیاسی اثر انگیزی میں ان شاء اللہ اضافہ ہو گا۔ انور ابراہیم کی مقبولیت بڑھے گی اور ڈاکٹر مہاتیر کی عالمی اور قومی حیثیت کم سے کم تر ہو جائے گی۔

مطبوعات عالمی ادارہ فکر اسلامی (پاکستان)	Price(Rs)	
National Security and Development Strategy by Arshad Zaman. (1990). pp. 119.	Paperback	100
Islamization of Knowledge: An Islamic Perspective by B.H. Siddiqui. (1991). pp. 22.	Paperback	25
Nationalism and Internationalism in Liberalism, Marxism and Islam. by Tahir Amin. (1991). pp. 138	Paperback Hardback	100 150
Quranic Concepts of Human Psyche by Zafar Afaq Ansari. (ed.) (1992). pp. 118.	Paperback Hardback	125 175
Knowledge: A Critical Overview by Seyyed Vali Reza Nasr. (1992). pp. 28,	Paperback	25
Islam and Economic Development by M. Umer Chapra. (1993). pp. 167.	Paperback Hardback	150 200
نفس انسانی کے قرآنی تصورات ظفر آفاق انصاری (۱۹۹۶) ۱۱۰ صفحات۔	Paperback Hardback	125 175
رہنمائے تربیت از ہشام الطالب (ط ۱۹۹۵) ۶۲۴ صفحات۔	Paperback Hardback	400 450
اسلام کا تصور جرم و سزا از خورشید احمد ندیم (ط ۱۹۹۵) ۲ مجلدات صفحات مجلد اول ۵۳۲ مجلد دوم ۴۳۹۔	Paperback Hardback each vol.	350 400
اسلام اور سیکولرزم از یوسف القرضاوی (ط ۱۹۹۵) ۲۶۱ صفحات۔	Paperback Hardback	200 250
مالی واجبات کی اشاریہ بندی (انڈیکسیشن) از سید محمد حسن الزمان (ط ۱۹۹۵) ۱۳۰ صفحات۔	Paperback Hardback	150 200
Indexation of Finan[illegible]l Assets: An Islamic Evaluation by S. M. Hasanuzzaman. (1993). pp. 108.	Paperback Hardback	100 150
An Introduction to Islamic Economics by Muhammad Akram Khan. (1994). pp. 153.	Paperback Hardback	150 200
Theories of Islamc Law by Imran Ahsan Khan Nyazee. (1994). pp. 344.	Paperback Hard back	200 250
Business Ethics in Islam by Mushtaq Ahmad. (1995). pp. 211.	Paperback Hardback	225 275
The Making of Religious Discourse: an Essay in the History and Historiography of the 'Abbasid Revolution by Muhammad Qasim Zaman. (1995). pp. 102.	Paperback Hardback	125 175
Islamic Law of Business Organization: Partnerships by Imran Ahsan Khan Nyazee. (1997). pp. 347	Paperback Hardback	250 300
Teachers Training: The Islamic Perspective by M. Zafar Iqbal. (1996). pp. 340.	Hardback	250
حجیت سنت از شیخ عبدالغنی عبدالخالق مترجم محمد رضی الاسلام ندوی (ط ۱۹۹۵) ۸۹۳ صفحات۔	Hardback	450
Islamic Law of Business Organization: Corporations by Imran Ahsan Khan Nyazee.	زیر طبع	
Economic Guidelines in the Qur'an by S.M Hasanuzzaman.	زیر طبع	
Muslim Understanding of Other Religions: A Study of Ibn Hazm by Ghulam Haider Aasi.	زیر طبع	

زیادہ تعداد میں خریداری پر معقول رعایت دی جائے گی۔ آرڈر درج ذیل پتے پر دیئے جا سکتے ہیں۔

عالمی ادارہ فکر اسلامی

۲۸، مین روڈ، F-10/2، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵۹، اسلام آباد

فون: 293734، 292384 فیکس نمبر: 280489

e-mail : <iiit@isb.comsats.net.pk> and <iiitpak@paknet2.ptc.pk>

رسائل و مسائل

جذبہ تبلیغ کی کمی

سوال: ۸۰ فی صد ان پڑھ لوگوں کو دعوت اسلامی سے کیسے روشناس کرایا جائے؟

جواب: اسلام کی دعوت جب عرب میں پیش کی گئی تھی اس وقت اس کی مخاطب آبادی تقریباً سو فی صدی ان پڑھ تھی۔ قریش جیسے ترقی یافتہ قبیلے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں صرف سترہ افراد پڑھے لکھے تھے۔ مدینہ میں اس سے بھی کم لوگ تعلیم یافتہ تھے اور باقی عرب کی حالت کا اندازہ آپ ان دو بڑے شہروں کی حالت سے کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید اس ملک میں لکھ کر نہیں پھیلایا گیا تھا بلکہ وہ لوگوں کو زبانی سنایا جاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ اس کو سن کر ہی یاد کرتے تھے اور پھر زبانی ہی اسے دوسروں کو سناتے تھے۔ اسی ذریعے سے پورا عرب اسلام سے روشناس ہوا۔ پس درحقیقت لوگوں کا ان پڑھ ہونا کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ نہ ہو سکتی ہو۔

آغاز اسلام میں اس دین کی تبلیغ ان پڑھ لوگوں ہی میں کی گئی تھی اور یہ محض تبلیغ و تلقین ہی تھی جس سے ان کو اس قدر بدل دیا گیا' ایسا زبردست انقلاب ان کے اندر برپا کر دیا گیا کہ وہ دنیا کے مصلح بن کر کھڑے ہو گئے۔ اب آپ کیوں یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ۸۰ فی صد ان پڑھ آبادی میں اسلام کی دعوت نہیں پھیلائی جا سکتی؟ آپ کے اندر ۲۰ فی صد تو پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ پڑھ کر اسلام کو سمجھیں' اور پھر باقی ۸۰ فی صد لوگوں کو زبانی تبلیغ و تلقین سے دین سمجھائیں۔ پہلے کی بہ نسبت اب یہ کام زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ البتہ فرق جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس وقت جو شخص بھی اسلام کی تعلیمات کو سن کر ایمان لاتا تھا وہ ایمان لا کر بیٹھ نہیں جاتا تھا بلکہ آگے دوسرے بندگان خدا تک ان تعلیمات کو پہنچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی تمام حیثیتوں پر مبلغ ہونے کی حیثیت غالب آ جاتی تھی۔ وہ ہمہ تن ایک تبلیغ بن جاتا تھا۔ جہاں جس حالت میں بھی اسے دوسرے لوگوں سے سابقہ پیش آتا تھا' وہ ان کے سامنے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات بیان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ وہ ہر وقت اس تلاش میں لگا رہتا تھا کہ کس طرح اللہ کے بندوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لائے۔ جتنا قرآن بھی اسے یاد ہوتا وہ

اسے لوگوں کو سناتا، اور اسلام کی تعلیمات جتنی کچھ بھی اسے معلوم ہوتیں ان سے وہ لوگوں کو آگاہ کرتا تھا۔ وہ انھیں بتاتا تھا کہ صحیح عقائد کیا ہیں جو اسلام سکھاتا ہے اور باطل عقیدے اور خیالات کون سے ہیں جن کی اسلام تردید کرتا ہے۔ اچھے اعمال اور اخلاق کیا ہیں جن کی اسلام دعوت دیتا ہے، اور برائیاں کیا ہیں جن کو وہ مٹانا چاہتا ہے۔ یہ سب باتیں جس طرح پہلے سنائی اور سمجھائی جاتی تھیں اسی طرح آج بھی سنائی اور سمجھائی جا سکتی ہیں۔ ان کے لیے نہ سنانے والے کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے نہ سننے والے کا۔ یہ ہروقت بیان کی جا سکتی ہیں اور ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔

اسلام نے کوئی ایسی نرالی چیز پیش ہی نہیں کی ہے جس سے انسانی طبائع مانوس نہ ہوں اور جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بڑے فلسفے بگھارنے کی ضرورت ہو۔ یہ تو دین فطرت ہے۔ انسان اس سے بالطبع مانوس ہے۔ اسے پڑھے لکھے لوگوں کی بہ نسبت ان پڑھ لوگ زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ فطرت سے قریب تر ہوتے ہیں، اور ان کے دماغ میں وہ پیچ نہیں ہوتے جو جاہلیت کی تعلیم نے ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغوں میں ڈال دیے ہیں۔

لہٰذا آپ ان پڑھ آبادی کی کثرت سے ہرگز نہ گھبرائیں۔ ان کی ناخواندگی اصل رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ آپ کے اندر جذبہ تبلیغ کی کمی اصل رکاوٹ ہے۔ ابتدائے اسلام کے مسلمانوں کی طرح ہمہ تن مبلغ بن جایئے اور تبلیغ کی وہ لگن اپنے اندر پیدا کر لیجیے جو ان کے اندر تھی۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اسلام کی دعوت پھیلانے کے بے شمار مواقع آپ کے منتظر ہیں جن سے آپ نے آج تک اس لیے فائدہ نہیں اٹھایا کہ آپ اپنے ملک کی آبادی میں سو فی صد خواندگی پھیل جانے کے منتظر رہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمان القرآن، جلد ۸۳، عدد ۳، مئی ۱۹۷۵، ص ۱۳۶-۱۳۷)

تنظیموں کی طرف دعوت دینا

س: موجودہ دور میں جو تنظیمیں ہیں مثلاً جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، سپاہ صحابہ، اہل حدیث، اشاعت التوحید، ان کے ساتھی اپنی تنظیم کی طرف دعوت دیتے ہیں، توحید و سنت کی طرف دعوت نہیں دیتے۔ حالانکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا میں یہ نہیں کہا گیا کہ تم ایک تنظیم پر متحد ہو جاؤ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تم قرآن پر متحد ہو جاؤ اور لوگوں کو توحید و سنت کی طرف بلاؤ۔ آج کل کی تنظیمیں امت میں انتشار و افتراق کا باعث بن رہی ہیں۔ فرقہ واریت اور گروہ بندی اور پارٹی بازی ہی کی وجہ سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا

ہے۔ اس بارے میں میری راہنمائی فرمائیں کہ کیا توحید و سنت کی دعوت کے بجائے تنظیموں اور پارٹیوں کی طرف دعوت دینا جائز ہے؟ میرا ذہن اس مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔ براہ مہربانی میری اس الجھن کو دور کرنے کی کوشش فرمائیں۔

ج: دین اسلام واحد ہے اور امت مسلمہ امت واحدہ ہے اور اتحاد امت کی بنیاد قرآن و سنت ہے۔ اس لیے جن لوگوں کے عقائد اہل سنت والجماعت یعنی ما انا علیہ واصحابی کے خلاف ہوں ان سے الگ رہنا چاہیے۔ باقی رہے اہل سنت والجماعت کے ائمہ اجتہاد کے اجتہادی اور فروعی اختلافات تو ان کو تحزب و تفرق اور باہمی تضلیل و تفسیق کا ذریعہ بنانا یہودیوں کی عادت تھی۔ امت مسلمہ کی وحدت کو اسی قسم کی فرقہ واریت نے نقصان پہنچایا ہے اور فرقہ واریت کی بنیاد پر تنظیمیں بنانا سرے سے جائز ہی نہیں ہے۔ دینی سیاسی جماعتوں کے موضوع پر تفہیم المسائل حصہ اول میں میرا تفصیلی مقالہ چھپا ہوا موجود ہے۔ آپ اگر اس کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کر لیں تو امید ہے کہ آپ کی الجھن دور ہو جائے گی۔ یہاں پر مختصر جواب ہی کافی ہے جو یہ ہے کہ جو تنظیمیں قرآن و سنت کے مطابق کام کرتی ہوں اور ان کا مقصد صرف اقتدار کا حصول نہ ہو بلکہ دعوت دین، تبلیغ دین، اعلائے دین اور توحید و سنت پر مبنی نظام قائم کرنا ان کا اصل ہدف ہو اور ان کے دستور، منشور اور طریق کار میں کوئی چیز قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو تو ان میں سے جس کی قیادت و امارت پر اعتماد ہو، اس کے ساتھ مل کر دین کا کام کرنا چاہیے۔ مقصد تنظیم نہیں ہے بلکہ دین ہے لیکن دین کے کام کے لیے تنظیم ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی کوششوں کے مقابلے میں اجتماعی کوششوں میں برکت اور قوت زیادہ ہوتی ہے اور غیر منظم جدوجہد کے مقابلے میں منظم جدوجہد زیادہ بار آور ثابت ہوتی ہے۔ لیکن دوسری دینی تنظیموں کے ساتھ تعصب نہیں کرنا چاہیے بلکہ ساری دینی تنظیمیں امت واحدہ کے اعضا کے طور پر باہمی تعاون و تناصر کے طور پر کام کرتی رہیں۔ یہی صحیح طریقہ ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ دینی تنظیموں کے امرا کی حیثیت امیرالمومنین کی نہیں ہوتی تاکہ ان کی اطاعت سے الگ ہونے والے کو باغی یا خارجی کہا جائے۔ اگر کوئی شخص ایک تنظیم سے الگ ہو کر کسی دوسری تنظیم کے ساتھ مل کر دین کا کام کرتا ہے جس کی قیادت پر اسے زیادہ اعتماد ہو تو وہ نہ باغی ہے اور نہ گناہ گار ہے بشرطیکہ وہ دوسری تنظیم بھی دین کا کام دین ہی کے طریقے پر کر رہی ہو۔

آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ دعوت، توحید و سنت اور اسلامی شریعت کی طرف دینی چاہیے لیکن دعوت دین کا کام اگر منظم طریقے پر کیا جائے تو یہ زیادہ موثر اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ تنظیم اور جماعت اصل مقصد نہیں ہوتی، "دعوت الی حبل اللہ" کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ذریعے کو اصل مقصد بنانا جائز نہیں ہے مگر

ذریعے کو نظرانداز کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ (مولانا گوہر رحمٰن)

جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت

س: میں چند مہینے پہلے جماعت اسلامی میں شامل ہوا ہوں لیکن میرے گاؤں میں جماعت اسلامی کے ایک رفیق تبلیغی جماعت کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا ان کا یہ طرز عمل جماعت اسلامی کے کام کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟

ج: یقیناً نقصان پہنچائے گا اور اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ جماعت اسلامی بھی دینی جماعت ہے اور تبلیغی جماعت والے بھی دین ہی کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان بلکہ تمام دینی جماعتوں کے درمیان باہمی تعاون ہونا چاہیے اور ایک دوسرے کے ساتھ الفت و محبت اور خیر خواہی کے تعلقات قائم کرنے چاہییں۔ تبلیغی جماعت کے طریقہ کار میں ایک کمی تو ہے اور وہ یہ کہ دین کے تبلیغ و تفہیم کے دوران اسلام کے اجتماعی اور حکومتی نظام کی تبلیغ نہیں کی جاتی اور حکمرانوں کی خرابیوں کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھائی جاتی۔ لیکن اس کمی کے باوجود یہ لوگ دین ہی کا کام کرتے ہیں اور ان کی صحبت میں وقت گزارنے والوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ خود میں بھی اپنی اصلاح کے لیے ان کی مجالس میں کبھی کبھی شرکت کرتا ہوں۔ البتہ مولانا مودودیؒ کی تحریکی فکر کے مطابق کام کرنے والی جماعت، جماعت اسلامی کا طریقہ کار اور لائحہ عمل میرے نزدیک جامع لائحہ عمل ہے جس میں دعوت دین کے ساتھ اعلاے دین کے لیے اصلاح حکومت کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ مگر تبلیغی جماعت کی مخالفت کرنا اور ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنا جماعت اسلامی اور اس کے راہنماؤں کی پالیسی نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ خوشگوار مراسم قائم کرنا اور ان کے کام میں تعاون کرنا ہمارا طریق کار ہے۔ آپ کے گاؤں کے کسی رفیق نے اگر کوئی دوسرا طرز عمل اختیار کیا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ (گ۔ ر)

جذبہ محبت میں بے اعتدالی

س: میرا ایک دوست' ایک مسئلے کا شکار ہے۔ اس کی زبانی مسئلہ یہ ہے: مجھے ایک ہم عمر سے محبت ہے۔ اس محبت نے جنونی شکل اختیار کر لی ہے۔ خواہش ہوتی ہے کہ یہ ۲۴ گھنٹے میرے ساتھ ہو' کسی دوسرے کو اس کے ساتھ دیکھنا گوارا نہیں۔ جب نماز پڑھتا ہوں یا کوئی اور کام کرتا ہوں' تو دل و دماغ میں یہ تصور ہوتا ہے کہ اس سے کب ملاقات ہو گی؟

ج: آپ کا دوست جس مسئلے کا شکار ہے' اس کی نوعیت آشکار ہے۔ صرف مسئلہ پوچھ لینے سے یہ مرض دور نہیں ہوتا۔ اس کا علاج بھی بہت آسان نہیں' لیکن اللہ کی مدد سے ہو سکتا ہے۔

۱- جس شخص سے بھی ایسی محبت ہو جائے' اس سے آدمی دور رہے۔ قصداً اس سے ربط نہ رکھے' ملاقات نہ کرے' پاس نہ بیٹھے اور دیکھنے سے بھی اجتناب کرے۔ یہ مشکل ہو گا' لیکن اگر یہ یقین ہو کہ یہ شیطان کا فتنہ ہے' تو ایسا کرنا ممکن ہو گا۔

۲- جب طبیعت میں جوش آئے' اس آدمی کا خیال آئے' تو اس کو نکالنے کی کوشش نہ کرے' بلکہ یہ سوچے کہ جب یہ آدمی مرجائے' اور قبر میں پہنچ جائے گا تو گل سڑ کر' کیڑوں کی غذا بن کر' کس شکل میں ہو گا؟ یہ بھی سوچے کہ اس کی مردہ لاش اگر تین دن پڑی رہے تو اس میں کتنی بدبو اور تعفن ہو گی۔ پھر کیا میں اس کے پاس بھی پھٹکنا پسند کروں گا؟

۳- جب اس آدمی کا خیال آئے' یا اس سے قرب کی خواہش پیدا ہو تو اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو یاد کرے۔ اللہ کا ذکر کرے کہ وہ میرے ساتھ ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ حضورؐ پر درود پڑھے اور صالح صحبت اختیار کرے۔

۴- جب آدمی قصداً کچھ نہیں کرے گا' اور ہر ممکن کوشش اس فتنے سے دور رہنے کی کرے گا' تو اس کے بعد جو کچھ خیال اور خواہش رہ جائے گی' امید ہے کہ استغفار کرتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔ (خرم مراد' ستمبر ۹۴)

کتاب نما

شمائل و اخلاق نبویؐ، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، ترجمہ و تخریج و تعلیق: ڈاکٹر محمود الحسن عارف۔ ناشر: نفیس اکلوی، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۴۰ روپے۔

ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و اخلاق پر شاہ ولی اللہ اور مرزا مظہر جان جاناں شہید کے شاگرد، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کے مخطوطے حلیہ شریفہ کے ترجمے کے ساتھ ساتھ تحقیق کے تمام لوازم کا اہتمام کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ قاضی ثناء اللہ کی تفسیر مظہری (دس جلدیں) کے علاوہ ۳۸ دیگر تصنیفات کا بھی انھوں نے مختصر تعارف کروایا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، قاضی صاحب کو "بیہقی وقت" کہا کرتے تھے۔ شمائل نبویؐ پر شمائل ترمذی معروف کتاب ہے اور اس کی کئی شروح لکھی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی سہواً ترمذی لکھ دیا جاتا ہے جب کہ یہ ایک علیحدہ تصنیف ہے۔ اس کے ۱۸ ابواب ہیں جب کہ شمائل ترمذی کے ۵۳ ابواب ہیں۔ شمائل ترمذی کے بعض موضوعات اس میں نہیں ہیں اور بعض اس میں ہیں جو اس میں نہیں۔ اس کتاب میں اخلاق حسنہ، حسن معاشرت، ایذا پر صبر اور اعتکاف کے اضافے نے اسے اتباع سنت کے مقصد سے زیادہ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس دور کے احیائے اسلام کے تقاضوں کے تحت مرتب کی گئی ہے۔

کتاب کا مطالعہ نبی پاکؐ سے عشق و محبت کو تازہ کرتا ہے اور روز مرہ زندگی میں اختیار کرنے کے لیے نمونے سامنے لاتا ہے۔ رسولؐ سے محبت کے نام پر ہم جان دینے کو تیار ہیں لیکن ہم آپؐ کے طریقوں سے کتنے دور ہو گئے ہیں۔ آپؐ کی سادہ رہایش، گھر کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کر لینا، کھجوریں خرید کر قمیص کے پلو میں ڈال کر لے آنا، گفتگو کرتے ہوئے مسکرانا، درشت سلوک پر بھی غصے میں نہ آنا، راتوں کی عبادت، دنیا کو اس کی جگہ پر رکھنا ــــــ کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔

مترجم نے متن کی احادیث کی تخریج کی ہے اور کتب احادیث میں جہاں آئی ہیں، اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ضروری وضاحت کے لیے حاشیے لکھے ہیں۔ اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے لیکن ۲۷ صفحے کا مخطوطہ، جو ہمارے اندازے سے آج کل کے ۳۲ صفحے کا کتابچہ ہے، ایک عام قاری

اضافوں کے بعد اسے اپنے لیے نہیں سمجھتا۔ صرف ترجمے کی اشاعت کی اپنی افادیت ہے۔ (مسلم سجاد)

بارگاہ رسالتؐ میں، مرتبہ: محمد متین خالد۔ ملنے کا پتا: مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۹۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

حج بیت اللہ اور عمرے کی ادائگی اور روضہ رسولؐ پر حاضری ایک مسلمان کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس خوش بختی پر، جس قدر بھی نازاں ہو کم ہے۔ اس سعادت سے بہرہ ور ہونے والے بہت سے لوگوں نے اپنی ذہنی و قلبی کیفیات اور جذبات و احساسات کو سپرد قلم کیا ہے۔ جناب محمد متین خالد نے زیر نظر کتاب میں ۷۰ کے قریب زائرین روضہ رسولؐ کے تاثرات جمع کیے ہیں۔ ان میں مختلف شعبوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر نامور اور معروف اصحاب شامل ہیں۔ یہ کیفیات دلچسپ بھی ہیں اور روح پرور اور جذبات انگیز بھی۔ یہاں انسان کو اپنے گناہوں کا احساس ہوتا ہے، جسم پر کپکپی طاری ہوتی ہے، جذبات امڈ آتے ہیں، آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور کبھی سسکیاں بھی نکل جاتی ہیں۔ اور انسان ایسی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے جنھیں پوری طرح بیان کرنا ممکن بھی نہیں۔ کبھی تو جی چاہتا ہے کہ اس جالی کو دیکھتے رہیں اور کبھی جی چاہتا ہے گنبد خضرا ہروقت نظروں کے سامنے رہے۔ اس کتاب میں اسی چاہت، اور لگن پر مبنی احساسات و جذبات اور کیفیات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

مرتب نے نہایت ذوق و شوق سے مختلف اصحاب کے تاثرات جمع کیے اور ناشر نے بڑے اہتمام سے خوب صورت انداز میں انھیں شائع کیا ہے۔ ابتدا میں اشفاق احمد اور طالب الہاشمی کی تقاریظ شامل ہیں۔ یہ دل کش گلدستہ ترتیب دینے پر محمد متین خالد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مصنفین کے ناموں کے ساتھ کتاب یا سفرنامے کا نام بھی دے دیا جاتا تو بہت اچھا تھا۔ سرورق روضہ رسولؐ کی جالی سے مزین ہے۔ (زبیدہ جبین)

پاکستان میں تعلیم کے زندہ مسائل، مسلم سجاد، مرتبہ: سلیم منصور خالد۔ ناشر: منشورات، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۳۸۰۔ قیمت: ۱۱۰ روپے۔

پیش نظر کتاب، پاکستان میں تعلیمی مسائل کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنے اور انھیں حل کرنے کے لیے قابل عمل تجاویز پر مشتمل ۲۷ مقالات کا مجموعہ ہے، جو مصنف نے وقتاً فوقتاً مختلف مجالس، مذاکروں اور مجلوں کے لیے تحریر کیے تھے۔ پروفیسر سلیم منصور خالد نے انھیں بڑی محنت سے سات عنوانات کے تحت مرتب کر دیا ہے اور اس طرح فلسفہ نظام تعلیم اور تعلیمی حکمت عملی سے متعلق پروفیسر مسلم سجاد کی فکر یکجا کتابی صورت میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ مسلم سجاد، نائب مدیر ترجمان القرآن، نہ صرف تعلیم بلکہ

امت مسلمہ کے عصری مسائل کے ناظر اور ناقد ہونے کے حوالے سے ایک معتبر نام بن چکے ہیں۔

تعلیم کی "نظریاتی اساس" کے تحت پانچ وقیع مضامین ہیں جن میں پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن اور نظریہ پاکستان کی میزان پر مروجہ تعلیمی نظام کو جانچا گیا ہے۔ "نصاب کی اسلامی تشکیل" کے عنوان سے نصاب سازی کے عمل اور درسی کتب کی تیاری پر مقالات ہیں۔ "تعلیم کا محور" کے عنوان سے ایک اچھے استاد کی صفات، طلبہ اور پاکستان کا تصور، ان کے اجتماعی ماحول اور مدرسے کی ثقافت پر گفتگو کی گئی ہے۔

خواتین کی تعلیم کا موضوع قیام پاکستان سے قبل بھی مسلم (اور غیر مسلم ہندی) معاشرے میں پرجوش بحث و تمحیص کا عنوان رہا ہے۔ مختلف دینی اور سیکولر حلقوں کی طرف سے اس سلسلے میں مختلف نقطہ ہاے نظر پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ پروفیسر مسلم سجاد نے خواتین کی تعلیم کے موضوع پر ایک مستقل کتاب "مخلوط تعلیم" بھی لکھی ہے۔ پیش نظر مجموعہ مضامین میں اس سلسلے میں چار مقالات ہیں: مخلوط یا جداگانہ تعلیمی ادارے: برطانیہ میں بحث، خواتین یونی ورسٹی: تعلیم نسواں کا اہم قدم، خواتین یونیورسٹی: ایک لائحہ عمل، اور عورت: معاشرت، ملازمت اور تعلیم۔

"تعلیمی ادارے" کے تحت چھ مضامین ہیں، جن میں متوازی نظام تعلیم، یکساں نظام تعلیم، دینی مدارس، مشنری تعلیمی اداروں اور نجی تعلیمی اداروں کے کردار پر بڑی معلومات افزا گفتگو کی گئی ہے۔ "تعلیم کے مسائل" کو عنوان بنا کر ۱۳ مضامین جمع کیے گئے ہیں جن میں ذریعہ تعلیم سے متعلق حکومتی فیصلوں، غیر ممالک میں تعلیم، تعلیم میں بیرونی مداخلت جیسے موضوعات پر بڑی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

اس مجموعے کا آخری مقالہ "پاکستانی نظام تعلیم: حکومتی سطح پر اصلاحی کوششیں" پاکستان جیسی ایک (دعوے کی حد تک) "اسلامی نظریاتی" ریاست میں تعلیم کی پامالی اور بے حرمتی کا ایک بھرپور جائزہ ہے۔ اس مقالے میں پروفیسر مسلم سجاد نے ۱۹۴۷ کی تعلیمی کانفرنس سے لے کر ۱۹۸۵ تک کی ان ساری "حکومتی کوششوں پر نظر ڈالی ہے، جو اچھے وعدوں، سنہرے خوابوں اور ان کی بھیانک تعبیروں پر مشتمل ہے"۔ مگر یہ صرف "ماتم یک شہر آرزو" ہی نہیں، بلکہ عملی تدابیر کے لیے راہ نما اصولوں کی نشان دہی بھی ہے۔ مصنف نے بجا طور پر کہا ہے کہ "جن حکومتوں نے اسلامی نظام کو اپنا مقصد قرار دیا ہے، انھیں بالخصوص اس طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔ اگر یہ کام شروع ہو جاتا، تو آج پیش رفت ہو چکی ہوتی اور عملی انقلاب کا آغاز نظر آتا، اور دوسرے اسلامی ممالک اس سے خوشہ چینی کرتے، لیکن اگر یہ کام آج بھی شروع نہ کیا گیا، مزید پچاس سال بعد بھی ہم اس مقام پر ہوں گے، جہاں آج کھڑے ہیں"۔ (پروفیسر عبدالقدیر سلیم)

اقبال، علامہ اقبال کیسے بنے؟ گوہر ملسیانی۔ ناشر: گوہر ادب پبلی کیشنز، مظہر فرید کالونی، صادق آباد۔

صفحات: ۱۷۶۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

اردو میں علامہ اقبال پر کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور جیسا کہ مصنف نے کہا ہے کہ اقبالیات کے گلشن پر بہار کے پھول، قلب و نظر کو خیرہ کرتے ہیں ــــ اس کے باوجود اقبال پر اچھی کتابوں کی ضرورت ختم نہیں ہوئی۔ گوہر ملسیانی، قبل ازیں متعدد ادبی و شعری تصانیف شائع کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اقبال کے آباو اجداد، والدین، اساتذہ، تعلیم اور ان کی عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بتایا ہے کہ ان کے والدین کی تربیت، اساتذہ کے فیضان اور مطالعہ قرآن نے اقبال کو، علامہ اقبال بنایا۔

گوہر صاحب کا اسلوب عام فہم اور سادہ ہے۔ اپنے موقف کو انھوں نے بہ کثرت حوالوں کے ذریعے زیادہ مستند بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اقبال کی شخصیت اور فکر و شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ ایک مختصر مگر مفید کتاب ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

غزوات رحمۃ للعالمینؐ، لالہ صحرائی۔ ملنے کا پتہ ادارہ مطبوعات سلیمانی۔ غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۳۰۰۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

معروف ادیب اور دانش ور جناب لالہ صحرائی حلقہ ادب اسلامی کے ابتدائی وابستگان میں سے ہیں۔ وہ شاعر نہیں تھے لیکن چند برس پہلے حرمین شریفین میں کی جانے والی، ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت ملا، اور انھیں نعت گوئی کی نعمت عطا ہوئی۔ وہ اب تک ایک ہزار سے زائد حمدیں اور نعتیں اور اتنی ہی تعداد میں قومی اور ملی نظمیں لکھ چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ۲۲ ایسے واقعات غزوات کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جن کے بارے میں سیرت کی اکثر مستند کتابوں میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ ہر غزوے کے تذکرے میں واقعات، اسباب اور نتائج کا ذکر شامل ہو۔

دین مصطفویؐ میں جہاد فی سبیل اللہ نہایت افضل و ارفع عمل ہے۔ مخالفین نے جہاد کے ثمرات و برکات دیکھ کر اس کے بارے میں مسلمانوں کے خلاف غلط فہمیوں کا طوفان اٹھانے کی کوشش کی ہے، جو اب بھی جاری ہے۔ حالانکہ جہاد تو انسانیت کے لیے باعث رحمت ہے۔ جو بات مولانا مودودیؒ نے فرمائی تھی، لالہ صحرائی نے اسے ایک شعر کا جامہ پہنایا ہے:

جہاد نشتر جراح کے مماثل ہے　　　نہیں ہے خنجر قاتل سا ظلم ڈھانے کو

موصوف کی یہ کاوش فنی اعتبار سے بھی بلند پایا ہے۔ دنیائے ادب کی بعض معروف شخصیات نے ان کی زیر نظر کاوش کو سراہا ہے۔ آخری حصے میں "جہاد و عشق" کے زیر عنوان سیرت پاکؐ کے بعض دیگر واقعات کو منظوم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے جناب لالہ صحرائی کو غزوات منظوم کی پیش کش میں اولیت کا

شرف حاصل ہو رہا ہے۔ بجائے خود یہ پہلو باعث برکت و سعادت ہے۔ اس کاوش کی غایت یہ ہے کہ :۔

ملے اے کاش! مجھے بھی نبیؐ کی خوشنودی
ہوں میں بھی حضرت حسانؓ کے قبیلے کا

کتاب نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ (د-ہ)

تبلیغی اصول، قرآن و حدیث کی روشنی میں، ریاض احمد خان۔ ناشر: مکتبہ اسلامی، ۳۱ سی، محمد علی روڈ، بمبئی۔ صفحات: ۴۴۔ قیمت: درج نہیں۔

مصنف کو ایک اعتراض تو یہ ہے کہ مولانا علی میاں نے، بانی تبلیغی جماعت "مولانا الیاسؒ" کے مقام و مرتبے کے تعین کے لیے، وہ ساری خصوصیات جو صرف نبی کے لیے خاص ہوتی ہیں، بڑے اہتمام کے ساتھ، مولانا کے لیے بیان کر دی ہیں" (ص ۳)۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر تبلیغی جماعت پر ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ سکوت عن المنکر (منکر کو نہ چھیڑو) کی قائل ہے، حالانکہ قرآن کی رو سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، لازم و ملزوم ہیں۔ حدیث نبویؐ کی رو سے منکر سے نہ روکنے والوں پر اللہ تعالیٰ عذاب نازل کر دے تو بعید نہیں (ص ۸)۔۔۔۔ ریاض احمد خاں صاحب نے تبلیغی حضرات کو نہی عن المنکر کے علاوہ بعض دیگر باتوں کی طرف بھی متوجہ کیا ہے، مثلاً یہ کہ ترجمے اور تفسیر کے ذریعے، قرآن کو سمجھنے اور پڑھنے سے عوام کو منع نہ کیا جائے یا دعوت کے کلام میں وضعی احادیث اور قصوں سے اجتناب کیا جائے وغیرہ۔۔۔۔ تبلیغی جماعت کے وابستگان کو، مصنف کی باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے۔ (د-ہ)

بیاد سید مودودیؒ، ڈاکٹر سفیر اختر۔ ناشر: دار المعارف، لوہر شرفو، واہ کینٹ۔ صفحات: ۱۳۲۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

زیر نظر مجموعہ، مصنف کے پانچ تحقیقی و تنقیدی مضامین اور چھ تبصروں کا مجموعہ ہے، جو گذشتہ بیس سالوں کے دوران میں لکھے گئے۔ مضامین: (۱) علامہ اقبال اور مودودی (۲) مطالعہ تاریخ، علامہ اقبال اور سید مودودی کی فکری مماثلتیں (۳) سید مودودی اور خیری برادران (۴) مولوی ابو محمد مصلح، بانی عالم گیر تحریک قرآن (۵) کیا "متاع کارواں" سید مودودی کی تحریر ہے؟۔۔۔ اور تبصرے: (۱) اقبال، دارالاسلام اور مودودی (۲) خطوط مودودی، اول (۳) مولانا ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مستری صاحب (۴) عنایات مودودی (۵) سید مودودی: مرد عصر و صورت گر مستقبل (۶) سید مودودی کے تعلیمی نظریات۔۔۔

اگرچہ تمام مضامین ہی محنت سے لکھے گئے ہیں اور اپنے اپنے موضوعات پر بہت قیمتی ہیں اور کسی نہ کسی درجے میں تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں، تاہم "کیا متاع کارواں سید مودودی کی

تحریر ہے؟" "علامہ اقبال اور سید مودودی" اور "سید مودودی اور خیری برادران" نسبتاً عمدہ مضامین ہیں۔
ہر مضمون کے ساتھ زمانہ تحریر دینا مناسب تھا۔ اس کتاب کے معیار و مزاج سے تبصرہ ۴ اور ۶ مطابقت نہیں رکھتے۔ ص ۱۲ کی سطر ۲۵ میں لکھا ہے کہ سید مودودی نے ترجمان القرآن کی ادارت ۱۹۳۲ میں سنبھالی اور ص ۶۱ پر لکھا ہے کہ اپریل' مئی ۱۹۳۳ میں ادارت سنبھالی۔ ۱۹۳۳ ہی درست ہے۔
ڈاکٹر سفیر اختر' چیزوں کو نفاست سے پیش کرنے کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ قدیم رسائل و جرائد پر ان کی نظر گہری ہے' اور چھپے ہوئے جواہر کا دوربینی سے کھوج لگا کر انھیں مہارت سے استعمال میں لانے کی' ان کی خداداد صلاحیت بھی قابل داد ہے۔ تاہم' ہماری ناقص رائے میں' زیر تبصرہ کتاب ان کی مذکورہ صلاحیتوں کا ایک چھوٹا سا ثبوت ہے۔ ہم ان سے کہیں زیادہ بڑے اور مربوط کام کی توقع رکھتے ہیں۔
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے رشحات قلم اور ملفوظات پر مشتمل انسائی کلوپیڈیائی ترکہ اگرچہ دین اسلام کے فدائیوں کی فکری اور عملی ضروریات کی کفایت کرتا ہے۔ تاہم سید مودودیؒ کے فکری منہاج' باقیات اور نشانات راہ پر ابھی بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے' جس کے نتیجے میں روشنی کے بہت سے نئے دریچے کھلیں گے۔ ان کی بکھری تحریروں کو سلیقے سے مدون کرنا بھی بڑا اہم کام ہے لیکن اس سے زیادہ بڑا کام ان سوالات کے جواب مہیا کرنا ہے جو وہ مقدمات کی صورت میں چھوڑ گئے ہیں۔ مثلاً اسلامی فلسفہ تاریخ کی روشنی میں' برعظیم پاک و ہند میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کا جائزہ اور اس کی تدوین --- مولانا محترم' حکمرانوں کی تاریخ کو ان کی پیدائش یا تخت نشینی کی جنگوں کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے اس امر کے قائل تھے اور توجہ دلاتے تھے کہ ان مسلمان حکمرانوں کے عہد حکومت کو خیشہ اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا' پرکھا اور پیش کیا جائے۔ محترم ڈاکٹر سفیر اختر بنیادی طور پر تاریخ کے استاد ہیں اور فلسفہ تاریخ کے رمز شناس بھی' اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا فطری امر ہے کہ وہ اس نہج پر بھی اپنے مطالعہ و تحقیق سے قارئین کو مستفید کریں گے۔
زیر نظر کتاب "مودودیات" کے ضمن میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ (سلیم منصور خالد)

تاریخ جھجر' مرزا بشارت علی۔ ناشر: علی منزل' ۵/۳۶ لیاقت آباد' کراچی۔ صفحات: ۲۰۰۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔
شروع میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستان کا راج سنبھالا تو اٹھاسی نواب' مہاراجے اور والی چھوٹی چھوٹی ریاستوں' جاگیروں اور راجواڑوں کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے تھے۔ رہتک کرنال اور حصار کے مردم خیز خطے پر مشتمل ریاست جھجر بھی انھی میں سے ایک تھی۔ اس ریاست نے ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں دہلی کے مغل حکمرانوں کی ہر طرح سے مدد کی اور اپنی فوجیں بھی بھیجیں۔ جھجر کے سپہ سالار جنرل عبدالصمد خان نے' جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کے حکم سے افواج دہلی کی کمان کی' جنھوں نے انگریزوں کو دہلی کے

مضافات میں مارچ ۱۸۵۹ تک سخت مزاحمت سے دوچار کیے رکھا۔ افسوس ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ میں' ریاست جھجر' اس کے آخری نواب عبدالرحمٰن خان کے مجاہدانہ کردار اور جنرل عبدالصمد خان کی خدمات کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔

مرزا بشارت علی نے زیر نظر کتاب میں ریاست مذکورہ کی تاریخ' ثقافت' مشاہیر' بزرگان دین اور عمارات وغیرہ کے تذکرے کے ساتھ' خاص طور پر جنگ آزادی میں اس کے نمایاں کردار کو پیش کیا ہے۔ پھر تقسیم ہند' فسادات اور ہجرت پاکستان کا بھی ذکر ہے۔

مصنف نے یہ دلچسپ کتاب برس ہا برس کی تلاش و تحقیق سے مرتب کی ہے۔ اس میں جھجر کے چند ایک شعرا کا کلام بھی شامل ہے اور انگریزوں کے مظالم کا تذکرہ بھی ہے۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے یہ کتاب ایک دلچسپ اور اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ریاست جھجر کے تمام علاقے موجودہ بھارتی ریاست ہریانہ کا حصہ ہیں۔ بہت مناسب ہوتا اگر مذکورہ علاقوں کی موجودہ صورت حال پر بھی روشنی ڈالی جاتی۔ بہرحال یہ کتاب برعظیم ہندو پاکستان کی تاریخ کا ایک گراں قدر باب ہے۔ مصنف نے جس طرح تاریخ کے اوراق کو محنت کے ساتھ کھنگالا اور اپنی ملازمتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ' ایک لگن کے ساتھ مسلسل اس منصوبے پر کام کرتے رہے وہ لائق تحسین ہے۔ (محمد ایوب منیر)

علوم القرآن' مقدمہ و تدوین: ڈاکٹر محمد میاں صدیقی۔ ناشر: پروگریسو بکس' ۴۰ بی' اردو بازار' لاہور۔ بہ اشتراک ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد۔ صفحات: ۳۶۸۔ قیمت: درج نہیں۔

قرآن حکیم کے علوم و معارف پر' مختلف زبانوں میں کتب و مقالات کا نہایت عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔ زیر نظر کتاب میں "علوم القرآن" کے مختلف پہلوؤں پر برعظیم پاکستان و ہند کے بعض علما اور محققین (عبدالقدوس ہاشمی' محمد تقی عثمانی' میر ولی الدین' جعفر شاہ پھلواری' سید بدر الدین علوی' احمد اقبال قاسمی' عبیداللہ فلاحی' امیرالدین مہر اور سید اطہر حسین وغیرہ) کے اردو مضامین مدون کیے گئے ہیں۔ ان کے مباحث کا دائرہ خاصا وسیع ہے' جیسے تاریخ نزول قرآن' تدوین قرآن' نظم قرآن' حروف مقطعات' ناسخ و منسوخ آیات' قرآن اور تعقل و تدبر اور فلسفہ' قرآن کے اردو تراجم و تفاسیر' فہارس قرآن' قرآن اور مستشرقین وغیرہ۔

یہ منصوبہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے فاضل ڈائریکٹر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کی تجویز و تحریک پر شروع کیا گیا تھا' اور ڈاکٹر محمد میاں صدیقی صاحب کی نگرانی میں تکمیل پذیر ہوا۔ اپنے موضوع پر ایک مفید انتخاب مقالات ہے۔ کہیں کہیں قرآنی آیات میں غلطیاں نظر آئیں' مثلاً ص ۴۲' ۷۰' ۷۱' ۷۷' ۲۱۷' ۲۰۶ ——

آیات پر اعراب لگانا ضروری تھا۔ (ر - ہ)

(مجلہ) **سیارہ**، سالنامہ ۱۹۹۸۔ ادارت: طاہر شادانی، حفیظ احسن، خالد علیم۔ پتا: ایوان ادب، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۸۴ روپے۔

سیارہ ربع صدی سے اسلامی ادب کی ترجمانی کر رہا ہے۔ زیر نظر خصوصی شمارہ ۴۴ بلند پایہ منظومات اور نثرپاروں کا جامع ہے۔ حمد و نعت میں حافظ لدھیانوی، عبدالعزیز خالد، ابو المجاہد زاہد، حفیظ تائب، عزیز بگھروی اور نظم و غزل میں فروغ احمد مرحوم، شان الحق حقی، محمد عثمان رمز، تابش دہلوی، نظر زیدی، اعجاز رحمانی، اسرار احمد سہاروی، عبدالرحمن بزمی اور ڈاکٹر شبنم سبحانی کی تخلیقات اور اسی طرح نثری حصے میں بھی برعظیم کے نامور لکھنے والوں کی تحریریں شامل ہیں۔ "مدینہ کی مہکار" عبدالرحمن عبد کا اثر انگیز مضمون ہے۔ دو تحریریں مولانا مودودیؒ پر، خرم مراد کا مضمون چودھری غلام محمد مرحوم پر اور تین مضامین بہ سلسلہ اقبالیات --- مزید برآں ابن فرید اور اعجاز احمد فاروقی کے افسانے وغیرہ --- خطوط اور تبصروں کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔ (ر - ہ)

مطبوعات موصولہ

☆ **فرصت کے لمحات**، مرتب: ابو زبیر۔ پتا: ادارہ الخدمت فلیٹ ۴، پہلی منزل، منظور پلازا، ۲۴ علامہ اقبال روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۴۳۔ قیمت: ۹۰ روپے۔ فرصت کے لمحات میں ذاتی مطالعے کے نوٹس اور اقتباسات کا مفید مجموعہ]۔

☆ **نقیب ختم نبوت** (ماہ نامہ) اشاعت خاص بہ یاد مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری، مدیر: سید محمد کفیل بخاری۔ پتا: دار بنی ہاشم، مہربان کالونی، ملتان۔ صفحات: ۳۰۲۔ قیمت: ۵۰ روپے۔ [مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے صاحبزادے مولانا ابو معاویہ ابوذر (سید عبدالمنعم) بخاری کی تحریروں اور ان پر مضامین کا معلومات افزا مجموعہ]۔

☆ **اسلامک ایجوکیشن**، سرپرست: محمد امیر ملک، نگران: علی احمد چودھری، مدیر: ظفر اقبال خان ربانی۔ ناشر: اسلامک ایجوکیشن، ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور۔ صفحات: ۱۷۹۔ قیمت: درج نہیں۔ [جامعہ پنجاب کے شعبہ تعلیم اسلامی کا مجلہ۔ اساتذہ اور طلبہ و طالبات کے مضامین اور نظموں کا مجموعہ]۔

☆ **کفایت اللہ**، شخصیت و خدمات، مرتبین: ڈاکٹر زینت اللہ ساجد، ظہور احمد ظہور۔ اہتمام: جشن کفایت اللہ کمیٹی، مالیر کوٹلہ بھارت۔ صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ [محمد عاصم الحداد مرحوم کے برادر بزرگ، ہیڈ ماسٹر محمد کفایت اللہ، حال مقیم مالیر کوٹلہ کے شاگردوں نے ان کی بے لوث تعلیمی و سماجی خدمات کے اعتراف میں، ان پر مضامین کا یہ مجموعہ پیش کیا ہے متعدد تصاویر بھی شامل ہیں]۔

مدیر کے نام

حبیب الرحمن ' تونسہ ' ڈیرہ غازی خان

بلاشبہ ترجمان القرآن اسلامی ' دینی ' تحقیقی ' علمی اور اصلاحی مضامین پر مشتمل ایک حسین گلدستہ ہے۔ جس میں امت کے نامور علما' مفکرین ' محققین اور مدبرین کی تحریریں اہل علم کی علمی پیاس بجھانے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ محترم خرم مرادؒ کی مساعی جلیلہ نے اس دینی علمی رسالے میں ایک جدت پیدا کی جس سے رسالہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ آپ نے بھرپور کوشش کی ہے اور رسالے کا معیار برقرار ہے۔ آپ رسالے میں جس طرح تمام مکاتب فکر کے مفکرین و علما کے مضامین کا انتخاب کرتے ہیں وہ قابل داد ہے۔ یوں تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ایک حسین انتخاب پیش کرتے ہیں۔ خصوصاً علما دیوبند اور دیگر عالم اسلام کے علما و مفکرین کی تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ مناسب سمجھیں تو اپنے انتخاب میں علما اہل حدیث کی ایسی تحریریں جو فرقہ واریت یا تعصب یا اختلاف فہم پر مشتمل ہوں کبھی کبھی شامل کر دیا کریں۔ امام علامہ ابن تیمیہؒ' علامہ ابن قیمؒ ' محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ جیسے علما و مفکرین کی آرا فکر پر مشتمل مضامین کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔

بریگیڈیئر (ر) قربان علی برلاس ' راولپنڈی

جناب قاضی حسین احمد صاحب کا مضمون "اسلامی تحریکیں : خدشات اور امکانات" (اکتوبر ۹۸) بہت غور سے پڑھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو کئی بار پڑھا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے ملک میں ایسے راہنما بھی موجود ہیں جو نہ صرف ملکی سیاست بلکہ بین الاقوامی امور پر بھی یکساں نظر رکھتے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ ایسے مضامین اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہونے چاہییں تاکہ وسیع حلقے تک پہنچ سکیں۔

مغرب میں غیر مسلم بھی اسلام میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اگر ترجمان القرآن کا انگریزی ایڈیشن شائع ہو سکے تو ایسے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو گا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ضیا ' پشاور

ترجمان القرآن کے اشارات ' علمی اور اہم مسائل پر قارئین کے لیے مدلل مباحث پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر علمیت کے ساتھ ساتھ طوالت سے بچا جائے تو اشارات کی چاشنی دوچند ہو جائے۔

سید حیدر زیدی ' لاہور

"۶۰ سال پہلے" ترجمان القرآن کا دلچسپ سلسلہ ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ۶۰ سال پہلے کہی ہوئی باتیں بالکل "آج کی باتیں" لگتی ہیں۔ یہ جہاں سید مودودیؒ کی فراست و بصیرت کی غماض ہیں وہاں تبدیلی اور انقلاب کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے تبدیلی حالات کے لیے بھرپور جدوجہد کی طرف بھی توجہ دلاتی ہیں۔



اللہ کے فضل و کرم سے
ثناءاللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی
ثناءاللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC
Cashmira
BLANKETS
ABC
KNITTING
YARNS
Plush Mink
BED
COVERS
AND
BLANKETS
SANAULLA
CARPET
YARNS
SANAULLA
WEAVING
YARNS
تیسری منزل، پیٹرولیم سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، کراچی۔ پاکستان
Phones: 516034 & 516035. Fax: 92-21-5681775.
Telex: 21699 SANA PK.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھیرائی گئی۔

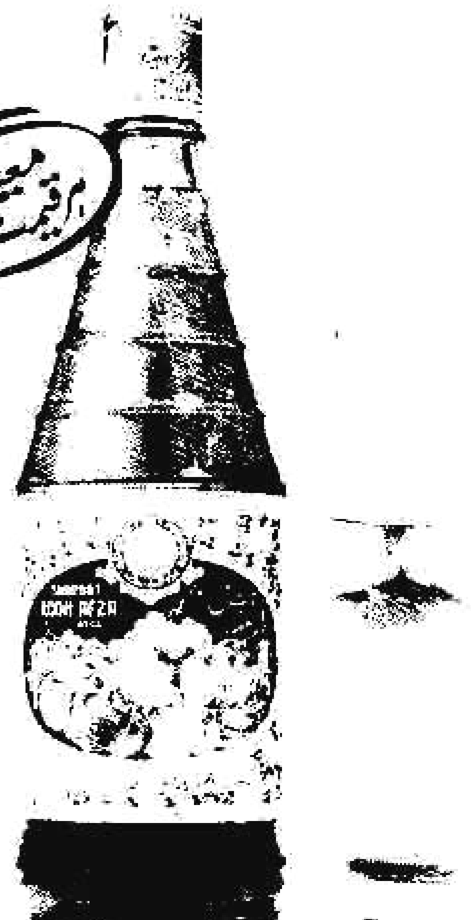
حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

یہ جاننے کے لیے کہ
پچھلے نوّے سال سے زائد عرصے سے رُوح افزا
کروڑوں شائقین کا پسندیدہ مشروب کیوں ہے،
آپ کو کسی تردّد کی ضرورت نہیں :

صرف

رُوح افزا

کا ایک گلاس نوشِ جاں کیجیے۔



تھنڈک اور فرحت لیے تازگی بھرا ذائقہ

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
[illegible]

Adarts-HRA-8/97

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE.